آفتابِ نبوّت
کی سُنہری شعاعیں
سیرتِ سرورِ عالم کے درخشاں پہلو
اللہ
رسول
محمد
عبد المالک مجاہد
دار السلام
DARUSSALAM

آفتابِ نبوّت

کی

سُنہری شعاعیں

سیرتِ سرورِ عالم کے درخشاں پہلو

عبدالمالک مجاہد

دارالسلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

فہرست مضامین

عرض مؤلف

2006 کی بات ہے کہ ڈنمارک کے ایک چھوٹے سے اخبار نے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ہرزہ سرائی کی اور ناپاک خاکے شائع کیے۔ان خاکوں کے خلاف دنیا بھر کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ کتنے ہی ملکوں میں شدید ہنگامے ہوئے ۔ ہڑتالیں ہوئیں۔ جلسے ہوئے ، جلوس نکالے گئے ۔مسلمانوں نے نے نہایت غم وغصے کا اظہار کیا۔ دنیا بھر کے مہذب لوگوں نے اس گھٹیا حرکت پر نفرت کا اظہار کیا۔مگر بدقسمتی سے اس احتجاج کو سنجیدگی سے لینے کی بجائے یورپ کے بعض دیگر ممالک نے بھی ان خاکوں کی اشاعت کی مذموم حرکت کرڈالی۔عربی کا ایک مقولہ ہے (رُبَّ ضارَّةٍ نافِعَةٌ) کہ بعض اوقات غلط کاموں کے نتائج بھی عمدہ نکلتے ہیں۔ جہاں ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ ہوا وہیں اہل حل وعقد نے سوچنا

شروع کیا کہ ایسا ہوا کیوں ہے؟۔اس سوال پر دنیا بھر میں کتنے ہی سیمینار اور مذاکرات ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت اوران کے حقوق کے حوالے سے مضامین اخبارات میں شائع ہوئے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ بلاشبہ مسلمانوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے حقوق ادانہیں کیے۔ان کی سیرت کولوگوں تک ان کی زبان میں نہیں پہنچایا گیا۔ارباب فکرودانش نے اللہ کے رسول ﷺ کے کردار، ان کے افعال اوران کے معاملات کودنیا کے سامنے اجاگر کرنے کی ضرورت پرزوردیااور پھر سیرت نبوی ﷺ کا دنیا بھر میں ایک نئے انداز سے چرچا شروع ہوا۔عربی زبان میں بطورخاص سیرت پاک پر درجنوں کتابیں تالیف کی گئیں نیز سیرت پاک کی کتابوں کومختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ گزشتہ دوسالوں میں سیرت پاک پرجتنی کتابیں شائع ہوئیں، تقسیم کی گئیں یاان کا مطالعہ کیا گیاماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

راقم الحروف بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہے جومحبت رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار ہے۔اوراس بات کا داعی ہے کہ اگراللہ کے رسول ﷺ کا حقیقی حسن دنیا والوں کو دکھا دیا جائے اوران تک ان کی زبان میں آپ ﷺ کی سیرت پہنچادی جائےتو ہرزہ سرائی کرنے والے آپ ﷺ کے ہمنوا بن جائیں۔پھر نجانے وہ کون سے مبارک لمحات تھے جب راقم نے جدہ سے شائع ہونے والے اردونیوز کے ایڈیٹرکوایک خط لکھا جس میں ان کوتجویز دی کہ آپ لوگ ہرروز سیرت پاک پرایک کالم شائع کیا کریں تا کہ قارئین کواللہ کے رسول ﷺ کے روز وشب کے

بارے میں جاننے کا موقع مل سکے۔اس لیے کہ وہ کائنات کی واحد ہستی ہیں جن میں دنیا بھر کی خوبیاں اور صفات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔فقط وہی ایک ایسی ذات ہیں جن کے ساتھیوں نے ان کی ایک ایک ادا کو نہ صرف نوٹ کیا بلکہ اس کو محفوظ کر کے ہم تک پہنچایا۔اور اللہ تعالی کی کروڑ ہا رحمتیں ہوں ان سیرت نگاروں پر جنہوں نے ان کے تمام اقوال اور افعال کو قلم بند کیا۔انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ تشنہ بیان نہیں چھوڑا۔معمولی معمولی باتیں بھی ہم تک پہنچائیں۔مثلاً ہمیں بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کھانا کیسے تناول فرماتے تھے؟ کتنی انگلیوں سے کھاتے تھے؟ ایک لقمے سے دوسرے لقمے کے درمیان کتنا فاصلہ رکھتے تھے؟ آپ ﷺ کائنات کی وہ واحد ہستی ہیں جن کے بارے میں سینکڑوں کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں تالیف کی گئی ہیں۔

اردو نیوز کے ایڈیٹر کو خط لکھے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ اردو میگزین کے ایڈیٹر برادرم رؤوف طاہر کا فون آیا۔ان کا کہنا تھا کہ سیرت کے حوالے سے آپ کی تجویز بڑی اچھی ہے مگر عملاً ہر روز سیرت پر کالم لکھنا اتنا آسان کام نہیں۔البتہ اسے ہفتہ وار اردو میگزین میں شائع کیا جا سکتا ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ یہ کالم آپ لکھیں۔یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ میں بھی سیرت سرورِ عالم ﷺ کے حوالے سے کچھ لکھ سکوں گا۔نہ مجھے عالم ہونے کا دعوی ہے اور نہ ہی میں کوئی سکہ بند لکھاری ہوں۔فون بند ہو گیا اور مجھے اس سوچ و بچار میں مبتلا کر گیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں سیرت طیبہ کے اوراق لکھوں۔پھر میں نے

سوچا اور غور وفکر کیا۔ ذہن میں آیا: عبدالمالک! گھر بیٹھے اتنی بڑی سعادت تمہیں مل رہی ہے۔ سیرت پاک پر لکھنا بلاشبہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔ قارئین کرام! اس روز میں خوشی سے خوب رویا۔ اپنی قسمت پر فرحاں وشاداں بھی تھا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں لکھوں گا۔ اللہ سے دعا کی: اے میرے اللہ! میرے قلم میں برکت عطا فرما۔ مجھے ہمت اور توفیق عطا فرما کہ میں نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں سیرت طیبہ کے اوراق لکھوں۔ شروع سے یہ طے کیا کہ سیرت طیبہ کے یہ اوراق علماء کے لیے نہیں بلکہ عام لوگوں کے لیے ہونگے۔ الفاظ نہایت آسان اور سادہ ہوں تا کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی انہیں سمجھ سکے۔ ہماری نوجوان نسل جوان دنوں سکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہے وہ اردو پڑھنے میں دقت محسوس کرتی ہے، لہذا یہ کالم نہایت ہی آسان اور سادہ انداز میں کہانی کی طرح ہو۔ تا کہ یہ دلوں میں اتر جائے۔ تاہم اس بات کا التزام کیا جائے کہ کوئی واقعہ موضوع یا غیر مستند نہ ہو۔ میں نے اردو میگزین کے ذمہ داران کو پہلے ہی دن بتادیا تھا کہ دنیاوی لالچ قطعا میرے پیش نظر نہیں ہے۔ آپ سے کسی جزا اور شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان کالموں کو بارگاہ الٰہی میں قبولیت حاصل ہوجائے اور قیامت والے دن مجھے اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت نصیب ہوجائے تو یہ سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

شروع میں سیرت نبوی ﷺ کا ایک ورق شائع ہوتا تھا۔ خود مجھے بھی تشنگی محسوس ہوتی تھی۔ ادھر قارئین کرام نے اس سلسلہ کو بہت پسند کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دو صفحات کردیے جائیں۔ اور پھر ایک دن رؤوف طاہر بھائی فون پر کہہ رہے تھے کہ

اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے دو صفحات تک بڑھا دیں۔ لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر میں نے ہاں کر دی۔

قارئین کرام! اس کے بعد گزشتہ دو سوا دو سالوں میں میرا بہت سا وقت سیرت پاک کے مطالعہ میں صرف ہوا۔ گھر پہنچنے کے بعد سیرت کی مختلف کتابیں ہوتیں اور میں ہوتا۔ پھر مختلف واقعات کو اپنے الفاظ میں ترتیب دے لیتا۔ یہ کام اتنا آسان بھی نہ تھا جتنا میں شروع میں سمجھتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد آتی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کام میں میرے لیے آسانی پیدا فرما دی۔ قلم میں روانی آتی چلی گئی اور جب میں لکھنے بیٹھ جاتا تو پھر قلم تسلسل سے لکھتا چلا جاتا۔

گزشتہ سال رمضان المبارک 2007 میں میرے گھر میں ڈاکٹر ف۔عبدالرحیم صاحب تشریف لائے۔ وہ شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ طیبہ میں گزشتہ چودہ سال سے مدیر مرکز الترجمات ہیں۔ یہ بلاشبہ بہت بڑی شخصیت ہیں۔ مدتوں مدینہ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ نہایت قابل اور ذہین وفطین شخصیت اور عربی زبان کے ماہر ہیں۔ میں ان کی اپنے والد کی طرح عزت کرتا ہوں۔ میں نے ان سے سیرت نبوی ﷺ کے اوراق کا ذکر کیا تو انہوں نے نہایت محبت اور پیار سے کہا کہ بس ان اوراق میں سے صرف واقعات کو نکال کر شائع کر دیں۔ ہماری نوجوان نسل کو اس کی شدید ضرورت ہے۔ ان کی یہ بات میرے دل کو لگی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آج رات ہی اس پر کام شروع کر دوں گا۔

اس دوران جو مضامین شائع ہو چکے تھے ہر چند کہ وہ کمپیوٹر میں محفوظ تھے مگر وہ کسی

ترتیب سے نہ تھے۔عزیزم نجم المجید سے کہا کہ ان کو ترتیب دیں۔ جب ان کو جمع کیا گیا تو وہ چھ سو صفحات سے کچھ زیادہ تھے۔اس کے بعد ایک نئے انداز سے کام شروع کیا گیا۔واقعات کونشان زد کر کے انہیں کتابی شکل دی گئی۔

جب کتاب تیار ہوگئی تو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ سیرت پر کتاب ہے۔ اسے عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔لہذا اس کے کاپی رائٹ نہیں رکھے جائیں گے اور اس کی قیمت بھی نہایت مناسب ہوگی۔اس کی پرنٹنگ دنیا کے سب سے اعلی ورق پر ہونی چاہیے۔فروری 2008 میں فرانس کی بلورائے کمپنی کا نمائندہ ریاض میں تھا۔کھانے کی ٹیبل پر میں نے جہاں اسے اسلام کا تعارف کروایا وہیں اس سے یہ بھی پوچھا کہ 70 یا 80 گرام کا پیپر سب سے اعلی کوالٹی میں کہاں بنتا ہے۔ یہ معروف کمپنی دنیا بھر میں سب سے اعلی کوالٹی کا باریک پیپر بناتی ہے۔ اسے عرف عام میں بائبل پیپر کہتے ہیں۔اس کا وزن 25 گرام سے 50 گرام تک ہوتا ہے۔میں نے اس کا نام بخاری پیپر رکھا ہوا ہے۔الحمد اللہ دارالسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے 25 گرام پیپر پر قرآن پاک پاکٹ سائز میں ہالینڈ سے شائع کیا تھا۔بعد میں صحیح بخاری عربی زبان میں 33 گرام پر اٹلی سے شائع کی۔اور پھر تمام کتب ستہ (المعروف صحاح ستہ) 40 گرام ورق پر ایک جلد میں شائع کیں جس میں 2772 صفحات ہیں۔اس کا سائز A-4 ہے۔ یہ کتاب اسلامی دنیا کا ایک شاہکار ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ دنیا میں سب سے اعلی پیپر کہاں تیار ہوتا ہے۔اس نے فن لینڈ کا نام لیا۔میری خواہش تھی کہ دنیا کے سب

سے مہنگے اور اعلیٰ کوالٹی کے پیپر پر یہ کتاب شائع ہو۔ مگر فوری طور پر اس کا بندوبست نہ ہو سکا۔ فرانسیسی نمائندہ نے حسب وعدہ اس کی تفصیلات تو بھجوا دیں مگر اس سے کتاب خاصی مہنگی ہو جاتی۔

قارئین کرام! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کی کتابوں کو سونے کے پانی سے شائع کرواتا اور انہیں عام کرتا۔ میری خواہش ہوگی کہ اہل ثروت اس اہم کام میں اپنا کردار ادا کریں۔ میں شکر گزار ہوں دارالسلام کے نگران اعلیٰ شیخ عبداللہ المعتاز اور ان کے بیٹے محمد المعتاز کا کہ انہوں نے میری اس خواہش کو خوش دلی سے قبول کیا۔ اس کتاب کے کوئی کاپی رائٹ نہیں ہونگے۔ دنیا کے ہر شخص کو اسے شائع کرنے، فوٹو کاپی کرنے اور کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ کسی بھی میگزین، رسالے اور اخبار میں بغیر کسی پیشگی اجازت کے اسے شائع کیا جا سکتا ہے۔ اگر مؤلف کا نام لکھنا چاہیں تو اجازت ہے نہ بھی لکھیں تو کوئی حرج نہیں۔ بہرحال سیرت کی کتب کو عام کرنا اور اسے ہر گھر تک پہنچانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ راقم کا دعویٰ ہے کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت احسن پیرائے میں اسلام دشمنوں تک انہی کی زبان میں پہنچا دی جائے تو پھر اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ان کے نظریات وخیالات یقینی طور پر تبدیل ہو جائیں گے۔ کم از کم مجھے سیرت پاک کے اوراق لکھنے سے جو فوائد حاصل ہوئے ان میں ایک یہ ہے کہ الحمد للہ، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ فِدَاهُ أَبِي وأُمِّي ونَفْسِي وكُلُّ شَيْءٍ عِنْدِي۔

بلا شک وشبہ وہ رب کائنات کے بعد سب سے اعلی اور ارفع ہستی ہیں۔ ہم ان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

فجر کی نماز کی ادائیگی اور روضہ رسول ﷺ پر درود وسلام پڑھنے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد مسجد نبوی میں بیٹھ کر یہ الفاظ اس خواہش کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ روز قیامت میرا شمار خدام رسول ﷺ میں سے ہو۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کی شفاعت نصیب ہو۔ ان کے جھنڈے تلے ہم اکٹھے ہوں اور ان کے مبارک ہاتھوں سے ہمیں حوض کوثر کا پانی نصیب ہو۔ (آمین ثم آمین، یارب العالمین)

نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنی اہلیہ محترمہ حافظہ انیسہ فردوس کا ذکر نہ کروں جنہوں نے میری اس کتاب کو مکمل کرنے میں خاصی تشجیع کی۔ تسلسل سے میرا حوصلہ بڑھایا، ساری کتاب کو پڑھا اور مجھے مفید مشورے دیے۔ میں اردو نیوز کے مینیجنگ ایڈیٹر جناب طارق مشخص، اردو میگزین کے ایڈیٹر جناب رؤوف طاہر، اردو نیوز کے نیوز ایڈیٹر جناب ابصار سید اور آرٹ ایڈیٹر شہزاد احمد کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ نہایت محبت سے سیرت کے اوراق شائع کر رہے ہیں۔ اور اگر شکریہ کی بات آئی ہے تو دار السلام لاہور برانچ کے حافظ عبد العظیم اسد، محبّ احمد کامران، حافظ محمد ندیم، مولانا محمد مشتاق اور خرم شہزاد کا بھی شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے بھی یہ کتاب پڑھی اور مناسب مشورے دیے۔ اور اس میں زبان وبیان کی مناسب تبدیلیاں کیں۔ دار السلام ریاض کی علمی کمیٹی کے انچارج برادرم قاری محمد اقبال عبد العزیز کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تخریج اور مراجعہ

کی ذمہ داری نبھائی۔ عزیزم نجم المجید نے اس کتاب کی خوبصورت ڈیزائننگ کی۔
واضح رہے کہ یہ سیرت کے متفرق واقعات ہیں۔ یہ مکمل سیرت کی کتاب نہیں ہے۔ ان شاء اللہ مستقبل میں مزید واقعات کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔
بارگاہ الٰہی میں عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ اس کاوش کو مؤلف، قارئین کرام اور جملہ معاونین کرام، سب کی نجات کا ذریعہ بنائے اور ہم سب کے لیے اسے ذخیرہ آخرت بنائے۔ (آمین)

کتاب وسنت کا ایک ادنی خادم:

عبدالمالک مجاهد

دارالسلام الریاض، لاہور

مدینہ طیبہ، مسجد نبوی شریف

26 جمادی الآخرۃ بروز پیر

بمطابق 30 جون 2008

1

داستان آپ ﷺ کے مبارک گھرانے کی

اللہ کے رسول ﷺ کا خاندان نہایت مبارک تھا۔ اس کی تاریخ آج سے کم و بیش چار ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے ایک شہر ''اُور'' کے باشندے تھے۔

یہ شہر فرات کے مغربی ساحل پر کونے کے قریب واقع تھا۔ اس کی کھدائی کے دوران جو کتبات برآمد ہوئے ہیں، ان کے باعث اس شہر کے بارے میں بہت سی تفصیلات منظر عام پر آئی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی بعض تفاصیل اور باشندگان ملک کے دینی اور اجتماعی حالات سے بھی آگہی ہوئی ہے۔ اس زمانے میں سلطنت بابل عروج پر تھی۔ سلطنت کی مالی حالت مستحکم اور فوجی طاقت زبردست تھی۔ دولت کی کثرت نے بادشاہ کے دماغ میں اس قدر غرور بھر دیا تھا کہ اس نے سلطنت کے بڑے معبد خانے میں اپنی سونے کی مورت رکھوا دی اور حکم دیا

کہ سب لوگ میری مورت کو سجدہ کریں اور منت ونذر ونیاز بھی میرے ہی نام کی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی ہدایت کے لیے ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث کیا۔ ان کا سلسلۂ نسب 9 واسطوں سے حضرت نوح علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

بادشاہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید پسند نہ آئی۔ کیونکہ اسے قبول کرنے کی صورت میں بادشاہ کو خدائی کے درجے سے اتر کر بندہ بننا پڑتا تھا۔ حضرت ابراہیم کی مخالفت صرف بادشاہ ہی نے نہیں کی بلکہ خود ان کے گھر کے افراد نے بھی کی۔ جب آپ نے قوم بادشاہ اور اپنے خاندان کی مخالفت دیکھی تو اپنے وطن سے ہجرت کا فیصلہ کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گزر اوقات کے لیے بھیڑ بکریاں پال رکھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں برکت دی اور وہ بڑھ کر بہت بڑے بڑے ریوڑ بن گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام انتہائی مہمان نواز تھے۔ ان کی کنیت ابوضیفان (مہمانوں والا، مہمان نواز) تھی۔ ان کے والد کا نام آزر تھا۔ بعض علمائے نسب نے والد کا نام تارخ بھی بیان کیا ہے۔ جب اس کی عمر 75 سال کی ہوئی تو اس کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ ناحور اور ہاران بھی تارخ کے بیٹے تھے۔ ہاران کے بیٹے لوط علیہ السلام تھے۔ ہاران کی وفات اس کے باپ ہی کی زندگی میں اسی علاقے میں ہو گئی تھی جہاں وہ پیدا ہوئے۔ یہ کلدانیوں کا علاقہ، یعنی بابل کی سرزمین تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شکل وصورت کے حوالے سے حدیث میں آتا ہے: میں نے عیسی ابن مریم، موسی اور ابراہیم علیہم السلام کو دیکھا، عیسی علیہ السلام سرخ فام،

گھنگریالے بالوں اور چوڑے سینے والے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام گندمی رنگ کے فربہ بدن تھے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا اور ابراہیم علیہ السلام؟ ارشاد ہوا: ''اپنے ساتھی (محمد ﷺ) کو دیکھ لو۔''

مراد یہ کہ اللہ کے رسول کی شکل وصورت اپنے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے انہیں عقل سلیم اور رشد و ہدایت سے نواز دیا تھا۔ وہ بڑے ہوئے تو انہیں رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور خلیل کا منصب عطا فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر مختلف انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اپنے والد کو جس عمدہ انداز میں انہوں نے توحید کی دعوت دی، اُسے سورۂ مریم آیت: 41 سے 48 میں پڑھیے۔ یہاں اتنی بات لکھے دیتا ہوں کہ انہوں نے دعوت توحید کا آغاز اپنے گھر سے کیا اور اپنے مشرک باپ کو بڑے ادب سے تبلیغ کی مگر باپ نے اتنا ہی نامناسب رویہ اختیار کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کو سخت دھمکی دی۔ قیامت والے دن ان کے باپ کے انجام کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ وہ نجاست میں لتھڑا ہوا ایک بجو کی شکل میں نظر آئے گا، جسے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ سال میں ایک بار شہر سے نکل کر عید (قومی جشن) منانے جایا کرتے تھے۔ ان کے والد نے ان کو بھی جشن میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ وہ کہنے لگے: میں بیمار ہوں۔ آپ نے کلام میں توریہ کیا تا کہ آپ بتوں کو پاش پاش کر کے ان کے مذہب کی غلطی ظاہر کر سکیں اور سچے دین کی

حقانیت واضح کر سکیں۔ جب لوگ عید منانے چلے گئے اور آپ شہر میں اکیلے رہ گئے تو آپ جلدی سے لوگوں کی نظروں سے بچ کر بتوں کے پاس پہنچ گئے۔ ان کو خوب سجا بنا کر ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ان کے سامنے طرح طرح کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان کا مذاق اُڑایا اور از راہِ استہزا پوچھا: ''تم کھاتے کیوں نہیں؟ تمھیں کیا ہوا ہے؟ تم بولتے کیوں نہیں؟'' پھر انہوں نے ایک بسولا (لوہے کا ایک بھاری ہتھیار جس سے بڑھئی لکڑی کاٹتے ہیں) ہاتھ میں لیا۔ سوائے بڑے بت کے تمام بتوں کو مار مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ سوائے بڑے بت کے (سب کو توڑ دیا) کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ روایات میں ہے کہ بعد ازاں آپ علیہ السلام نے بسولا بڑے بت کے ہاتھ میں رکھ دیا تاکہ یہ تاثر ملے کہ اسے اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی عبادت ہوتے دیکھ کر غصہ آ گیا، اس لیے اس نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

جب لوگ جشن سے فارغ ہو کر آئے اور اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا تو کہنے لگے: ہمارے معبودوں کو کس نے توڑا ہے؟ یہ کام کس نے کیا ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے، اُسے ابراہیم کہتے ہیں۔ وہ ان کے عیب بیان کرتا ہے، ان کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے۔ اسی نے پیچھے رہ کر انہیں توڑا ہے۔ لوگ کہنے لگے: اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ گواہ رہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہی چاہتے تھے کہ سب لوگ جمع ہو جائیں تو تمام بت پرستوں کے سامنے ان کا عقیدہ غلط ہونے کی دلیل پیش کی جائے، چنانچہ سب لوگ جمع ہو

گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس مجمع عام کے سامنے آ گئے۔ لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کا یہ حشر تم نے کیا ہے؟ انہوں نے کہا: یہ کام ان کے اس بڑے بت نے کیا ہوگا اگر یہ بولتے ہیں تو ان سے پوچھ لو۔ اب قوم نے غور وفکر کیا۔ اپنے سر جھکا لیے، پھر اپنے آپ کو خود ملامت کرنے لگے کہ تم نے خود ہی غلطی کی کہ ان کے پاس کوئی چوکیدار اور محافظ نہیں چھوڑا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہنے لگے کہ تمہیں معلوم ہے یہ بُت باتیں نہیں کرتے، پھر آپ ہمیں کیوں کہتے ہیں کہ ان سے پوچھ لو۔

چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں جو جواب دیا وہ اس طرح تھا: ''پھر تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو تمہیں نہ کچھ فائدہ دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں، تف ہے تم پر اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ان پر بھی، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟'' [1]

قوم نے لاجواب ہونے پر وہی رویہ اپنایا جو ہر سرکش اور متکبر شکست کھانے پر اختیار کرتا ہے، لہٰذا مشرک قوم نے اکٹھے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نشانِ عبرت بنانے کا پروگرام بنایا۔ بت پرست کہنے لگے: ایک عمارت بناؤ، اس میں آگ جلاؤ، پھر اس کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دو۔ چنانچہ انہوں نے ہر ممکن جگہ سے ایندھن جمع کرنا شروع کیا۔ اور ایک مدت تک اکٹھا کرتے رہے، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر کوئی عورت بیمار ہو جاتی تو یہی نذر مانتی کہ اگر مجھے شفا ہو گئی تو

---

[1] الأنبياء: 67,66/21.

ابراہیم کو نذر آتش کرنے کے لیے اتنا ایندھن دوں گی۔ پھر عمارت کے اندر ایک وسیع ہموار جگہ میں تمام ایندھن رکھ کر اسے آگ لگا دی گئی۔ آگ روشن ہوئی، بھڑکی، اس کے شعلے بلند ہوئے اور اس سے اتنی چنگاریاں اڑنے لگیں جو اس سے پہلے کبھی کسی نے نہ دیکھی تھیں۔ فارس کے بدوؤں میں سے ہیزن نامی کُردی شخص نے ایک منجنیق بنائی۔ یہ آلہ سب سے پہلے اسی شخص نے بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا۔ وہ قیامت تک دھنستا ہی چلا جائے گا۔ لوگوں نے آپ کو پکڑ کر باندھ دیا اور مشکیں کس دیں۔ اس وقت آپ کی زبان پر ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيل'' کے الفاظ تھے، یعنی ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔...... اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا: اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر سلامتی والی بن جا۔ سلامتی والی سے مراد یہ کہ اتنی ٹھنڈی نہ ہو جانا کہ حضرت ابراہیم کو اس کی ٹھنڈک سے تکلیف محسوس ہو۔

صحیح بخاری میں ام شریک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے چھپکلی کو ہلاک کرنے کا حکم دیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ تیز کرنے کے لیے پھونکیں مارتی تھی۔

حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صرف وہ رسیاں جلائیں جن سے وہ باندھے گئے تھے۔ بہر حال کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فتح پانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مغلوب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انبیاء میں فرمایا ہے: ''اور ان لوگوں نے تو ابراہیم کا برا چاہا تھا مگر ہم نے انہی کو

نقصان میں ڈال دیا۔''[1] بلا شبہ یہ ایک کڑی آزمائش تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پورے اترے اور کامیاب ہوئے۔

قرآن پاک نے ابوالانبیاء کا ایک سرکش اور ظالم بادشاہ کے ساتھ مناظرے کا ذکر بھی کیا ہے، وہ بابل کا بادشاہ تھا۔ اس کا نام نمرود بن کنعان تھا۔ یہ شخص پوری دنیا پر حکومت کرتا تھا۔ علماء کے قول کے مطابق پوری دنیا پر صرف چار بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔ ان میں سے دو مومن اور دو کافر تھے۔ مومن تو ذوالقرنین اور حضرت سلیمان علیہ السلام تھے اور کافر نمرود اور بخت نصر ہیں۔ علماء کے مطابق نمرود مسلسل چار سو سال تک بادشاہ رہا۔ مؤرخین کے مطابق ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مناظرہ اس روز ہوا جس دن وہ آگ سے نکلے۔

امام ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ نمرود نے اشیائے خوردنی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ لوگ غلہ لینے اس کے پاس جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس کے پاس غلہ لینے چلے گئے۔ اس سے پہلے ان دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت یہ مناظرہ ہو گیا۔ سورۂ بقرہ آیت: 258 میں اس کا ذکر ہے۔ نمرود نے اپنے رب ہونے کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ اس کے سامنے دو آدمی پیش ہوئے جن کے لیے سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا۔ اس نے ایک کو قتل کرنے کا حکم دیا اور دوسرے کو معاف کر دیا۔ اس طرح اس نے یہ

---

[1] الأنبياء 21:70.

فریب دینے کی کوشش کی کہ اس نے ایک کو موت دے دی ہے اور دوسرے کو زندگی بخش دی ہے۔ یہ بے کار بات تھی۔ اس کا موضوع مناظرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہر حال حضرت ابراہیم نے اُسے ایک اور دلیل دی کہ اللہ وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، لہٰذا تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا! یہ بات سن کر کافر ششدر رہ گیا۔ وہ لاجواب ہو گیا تو اس نے حضرت ابراہیم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا۔ آپ واپس گھر کے قریب پہنچے تو دونوں بورے مٹی سے بھر لیے۔ دل میں سوچا کہ جب میں گھر پہنچوں گا تو گھر والے مطمئن ہو جائیں گے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے بورے اتارے اور سو گئے۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ اٹھ کر بوروں کے پاس گئیں تو دیکھا کہ وہ عمدہ غلے سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کھانا تیار کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیدار ہوئے تو دیکھا کہ کھانا تیار ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟ زوجہ محترمہ نے فرمایا کہ آپ جو غلہ لائے تھے اسی سے تیار کیا ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ رزق اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر عطا فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ظالم کا خاتمہ اس طرح کیا کہ اس کی فوج پر اتنے مچھر بھیج دیے کہ ان کی چھاؤں میں سورج چھپ گیا، پھر ان مچھروں کو لشکر پر مسلط کر دیا۔ انہوں نے ان کا گوشت اس طرح نوچا کہ صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں۔ ایک مچھر نمرود کی ناک میں گھس گیا۔ اللہ نے اس کے ذریعے اسے ایک مدت تک عذاب میں مبتلا رکھا، اس کے سر پر ہتھوڑے سے ضربیں لگائی جاتی تھیں حتی کہ وہ اللہ کے حکم سے ہلاک ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کی ہٹ دھرمی، انکار اور کفر پر اصرار دیکھا تو ہجرت کا ارادہ فرمالیا۔ آپ نے شام کے علاقے کی طرف ہجرت فرمائی۔ یہ وہ مقدس سرزمین ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جہان والوں کے لیے برکت رکھی ہے۔ کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد انہوں نے مصر کا رخ کیا۔

مصر میں اس وقت جو شخص حکمران تھا اس کا نام رقیون تھا۔ وہ دراصل بابل ہی کا باشندہ تھا۔ ممکن ہے مصر جاتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہم وطنی کے رشتے کو وجہ تعارف خیال کر لیا ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ کے ساتھ جب مصر پہنچے تو مصر کے اس بادشاہ کو بتایا گیا کہ یہاں ایک شخص آیا ہے جس کے ساتھ ایک حسین ترین خاتون ہے۔ اس نے آپ علیہ السلام کو بلا بھیجا اور پوچھا یہ عورت کون ہے؟ اس بادشاہ کا معاملہ یہ تھا کہ اگر وہ بھائی بہن کو ایک ساتھ پاتا تو بہن کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا تھا، اس لیے آپ نے فرمایا یہ میری بہن ہے۔ آپ نے حضرت سارہ سے جا کر کہا کہ اس وقت روئے زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مؤمن موجود نہیں، اس نے مجھ سے تیرے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے بتایا ہے کہ تو میری بہن ہے۔ اب میری بات جھٹلا نہ دینا۔ بادشاہ نے سارہ کو طلب کیا۔ جب وہ اس کے سامنے پیش ہوئیں تو اس نے ہاتھ بڑھا کر آپ کو چھونا چاہا تو اسے پکڑ لیا گیا، یعنی حرکت نہ کر سکا۔ اس نے کہا: تم میرے لیے اللہ سے دعا کرو تو میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ اللہ کے برگزیدہ نبی کی بیوی ہے تو اس نے حضرت

ابراہیم کی نہایت قدر ومنزلت کی۔ اور جب وہ وہاں سے وطن کو واپس ہوئے تو اس نے اپنی بیٹی ہاجرہ بھی ساتھ کردی تاکہ اس نیک خاندان میں اس کی تربیت ہو اور وہ اپنے ہی ملک اور قدیم نسل کے باشندوں سے بیاہی جائے۔ اپنے مہمان نواز بادشاہ کی خوش آیند آرزو کو پورا کرنے کی غرض سے حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کرلیا۔ اللہ نے انہیں پہلا بیٹا اسی کے بطن سے عنایت کیا۔ اس کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھا گیا۔

یہ جو اوپر والا واقعہ ہے وہ میں نے مشہور سیرت نگار علامہ سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی شہرت یافتہ کتاب رحمۃ للعالمین ﷺ سے لیا ہے۔ ان کے مطابق حضرت ہاجرہ ایک کنیز نہ تھیں بلکہ ایک شہزادی تھیں۔ الرحیق المختوم کے مؤلف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ بھی اس طرف گئے ہیں کہ بادشاہ حادثے کی نوعیت سے سمجھ گیا کہ حضرت سارہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہایت خاص اور مقرب بندی ہیں۔ وہ سیدہ سارہ کی اس خصوصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہ کو ان کی خدمت میں دے دیا، پھر سیدہ سارہ نے حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا۔ قاضی صاحب نے بہت سے دلائل وبراہین سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ہاجرہ لونڈی نہیں تھیں بلکہ شاہ مصر کی بیٹی تھیں اور ان کی ایک اور خوبی بحوالہ تورات یہ بھی بیان کی ہے کہ اللہ کے ہاں بھی ان کا درجہ بالاتر تھا۔ اللہ کے فرشتے ہاجرہ کے سامنے خود آتے اور اللہ کا حکم پہنچایا کرتے تھے۔ مگر سارہ بی بی کے سامنے کبھی کوئی فرشتہ نہیں آیا۔ بہر حال حقائق کے متلاشی قاضی صاحب کی

رحمۃ للعالمین کا مطالعہ فرمائیں۔ ان پر حقیقت حال واضح ہو جائے گی۔[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ کو ہمراہ لے کر فلسطین واپس آئے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ایک فرزند ارجمند اسماعیل علیہ السلام عطا فرمایا۔ اس پر حضرت سارہ کو جو بے اولاد تھیں بڑی غیرت آئی۔ اسی دوران حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی طرف سے اشارہ پا کر دونوں ماں بیٹے کو ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

بعد میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ آپ اللہ کے حکم سے ان دونوں کو لے کر حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں ایک بے آب و گیاہ وادی میں بیت اللہ شریف کے قریب ٹھہرا دیا۔[2]

---

[1] رحمۃ للعالمین: 35,34/1۔

[2] ملخصا عن البدایۃ والنہایۃ: 1/149-164۔

2

اللہ کے رسول ﷺ کے آباء واجداد

ہجرت کے سفر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہاران کے بیٹے لوط اور آپ کی اہلیہ سارہ بھی ہمراہ تھیں۔ انہوں نے بابل، یعنی کلدانیوں کی سرزمین سے ہجرت کرتے ہوئے کنعانیوں کی سرزمین کا رخ کیا۔ یہ لوگ حران کے مقام پر رہائش پذیر ہوئے، یہی بیت المقدس کا علاقہ ہے۔ حران کے باشندے بھی ستاروں اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سارہ علیہا السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے سوا اس وقت دنیا بھر کے لوگ کافر تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب سیدہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو میاں بیوی میں یہ باتیں ہوئیں۔ ہاجرہ: ہمیں یہاں کس کے پاس چھوڑ چلے؟ حضرت ابراہیم: اللہ کے پاس۔ یہ جواب سن کر کہنے لگیں: تو پھر میں اپنے اللہ پر راضی ہوں۔ اس وقت بیت اللہ شریف نہ تھا۔ صرف

ٹیلے کی طرح ابھری ہوئی زمین تھی۔ سیلاب آتا تو دائیں بائیں کترا کر نکل جاتا تھا۔ وہیں بالائی حصے میں ایک بہت بڑا درخت بھی تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں آج کل زم زم کا چشمہ ہے۔ حضرت ابراہیم نے اسی درخت کے پاس حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑا تھا۔ اس وقت مکہ میں پانی تھا نہ کوئی آدم زاد۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک توشہ دان میں کھجوریں اور ایک مشکیزے میں پانی رکھ دیا اور خود واپس فلسطین چلے گئے۔ چند دن کے بعد کھجوریں اور پانی ختم ہو گیا۔ اب حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو پیاس لگی۔ بچہ پیاس کی وجہ سے بے چین ہو گیا۔ وہ اسے تڑپتا نہ دیکھ سکیں، اٹھ کر چل دیں۔ انہیں اپنے قریب کی زمین سے صفا پہاڑ سب سے قریب معلوم ہوا، وہ اس پر چڑھ گئیں۔ وادی کی طرف منہ کر کے دیکھا کہ کیا کوئی انسان نظر آتا ہے؟ ان کی نظر تھک کر لوٹ آئی۔ کوئی انسان نظر نہیں آیا۔ وہ صفا سے اتریں۔ وادی کے نشیب میں پہنچیں تو قمیص کا دامن جو زمین تک پہنچتا تھا، اٹھا کر یوں بھاگیں جس طرح کوئی پریشان یا مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ حتی کہ وادی کو پار کر لیا۔ وہ مروہ تک پہنچیں تو اس پر چڑھ گئیں اور دیکھا کہ کیا کوئی نظر آتا ہے؟ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ وہ عالم اضطراب میں صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتی رہیں۔ انہوں نے سات دفعہ اسی طرح چکر کاٹے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: لوگ اسی وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں (صفا اور مروہ) کے درمیان دوڑتے ہیں۔

جب وہ آخری چکر میں مروہ پر پہنچیں تو انہیں ایک آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ کھڑا ہے۔ اس نے اپنی

ایڑی یا پر سے زمین کھودی تو پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ وہاں پہنچیں، پانی کو حوض کی شکل دینے لگیں۔ چلو بھر بھر کے مشکیزے میں ڈالنے لگیں۔ ان کے مشکیزہ بھرنے کے بعد پانی پھر نکل آیا۔ انہوں نے خود پیا، اپنے بچے کو پلایا۔ فرشتے نے ان سے کہا کہ آپ ہلاکت کا اندیشہ نہ کریں۔ یہاں اللہ کے گھر کی تعمیر یہ بچہ اور اس کے والد مل کر کریں گے۔

اللہ اپنے بندوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحمت فرمائے۔ اگر وہ زمزم کو بہنے دیتیں ...... یا فرمایا اگر وہ پانی سے چلو نہ بھرتیں...... تو وہ ایک بہتے ہوئے چشمے کی صورت اختیار کر لیتا۔ کچھ وقت گزرا تو کدا کی طرف سے بنو جرہم کا ایک قافلہ وہاں سے گزرا۔ قافلے نے مکہ کے نشیبی علاقے میں قیام کیا۔ قافلے والوں کو ایک پرندہ منڈلاتا نظر آیا۔ وہ کہنے لگے: یہ پرندہ تو پانی پر منڈلایا کرتا ہے۔ یہاں تو پانی نہیں ملتا۔ انہوں نے دو آدمیوں کو بھیجا کہ جا کر دیکھو حقیقت کیا ہے۔ انہوں نے پانی کا کنواں دیکھا تو آ کر اپنے قبیلے والوں کو اطلاع دی۔ سارا قافلہ وہاں آ گیا۔

وہاں حضرت حاجرہ تھیں۔ قافلے والے ان سے کہنے لگے: کیا آپ ہمیں یہاں خیمہ زن ہونے اور کنویں کا پانی استعمال کرنے دیں گی؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ مگر ساتھ ہی فرمایا کہ اس کنویں پر ان کا کوئی حق ملکیت نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے اپنے اور عزیزوں کو بھی بلوالیا۔ اس طرح وہاں کئی گھر بس گئے۔ یوں مکہ مکرمہ میں آبادی کا آغاز ہوا۔ بنو جرہم کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ پہلے مکہ کے گردوپیش کی وادیوں میں سکونت پذیر تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ یہ لوگ رہائش کی غرض سے مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی آمد کے بعد اور ان کے جوان ہونے سے پہلے وارد ہوئے تھے۔ تاہم اس وادی سے ان کا گزر پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کتنی بار اپنی بیوی اور بیٹے سے ملنے کے لیے مکہ آئے؟ اس کی تفصیل کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ تاہم کم از کم وہ چار مرتبہ یقیناً تشریف لائے۔

ان چار سفروں میں سب سے پہلا سفر تو وہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت کے حکم پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا فقید المثال اہتمام کیا۔ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ بیٹے سے ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ حکم الٰہی ہے۔ باپ بیٹا دونوں تیار ہو گئے۔ دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور پوری قوت سے گلے پر چھری چلا دی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی: اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اللہ نے انہیں فدیے میں ایک عظیم ذبیحہ عطا فرمایا۔ اس سنت ابراہیمی کی یاد آج تک منائی جاتی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان عید الاضحیٰ کے روز جانور ذبح کرتے ہیں اور یہ عمل خیر قیامت تک کرتے رہیں گے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ جرہم قبیلہ مکہ میں آباد ہو گیا۔ حضرت اسماعیل

جوان ہوئے تو انہوں نے ان سے عربی زبان سیکھ لی۔ اور انہی کے خاندان میں شادی کر لی۔ ادھر حضرت حاجرہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے مکہ آئے۔ حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ بہو موجود تھی۔ اس سے حالات دریافت کیے۔ اس نے تنگ دستی کی شکایت کی۔ فرمایا: جب اسماعیل گھر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسماعیل گھر آئے تو بیوی نے سارا واقعہ بیان کیا کہ اس طرح ایک بزرگ آئے تھے اور وہ یہ پیغام دے گئے ہیں۔ کہنے لگے: وہ میرے والد گرامی تھے۔ گھر کی چوکھٹ تم ہو، تم کو تبدیل کرنے کا حکم دے گئے ہیں۔ انہوں نے بیوی کو طلاق دے دی۔ اب انہوں نے دوبارہ شادی کی۔ یہ شادی بنو جرہم کے سردار مضاض بن عمرو کی بیٹی سے ہوئی۔

حضرت ابراہیم ایک مرتبہ پھر مکہ آئے۔ اتفاق سے اس مرتبہ بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ بہو سے ملاقات ہوئی، گھر کے حالات پوچھے۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بتایا کہ گھر میں خیر و برکت ہے۔ شکار کا گوشت کھاتے ہیں۔ آپ نے اسے کہا کہ تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ برقرار رکھے۔ چوتھی مرتبہ جب حضرت ابرہیم علیہ السلام تشریف لائے تو حضرت اسماعیل زمزم کے پاس بیٹھے تیر گھڑ رہے تھے۔ والد گرامی کو دیکھا تو نہایت خوش ہوئے، والد کی بے حد عزت وتکریم کی۔ بڑی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس سفر میں دونوں باپ بیٹے نے مل کر بیت

اللہ شریف تعمیر کیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ساری دنیا کے لوگوں کو حج کے لیے آنے کی دعوت دی۔ [1]

حضرت اسماعیل کو اللہ تعالیٰ نے مضاض کی بیٹی سے بارہ بیٹے عطا فرمائے۔ جن میں سے نابت اور قیدار زیادہ مشہور ہوئے۔ قیدار مکہ میں مقیم رہے۔ یہی ہمارے پیارے رسول ﷺ کے جد امجد تھے۔ [2]

---

① البداية والنهاية: 1/164-166 .

② البداية والنهاية: 1/201،202 .

3

خاندان نبوت کی عظمت و وجاہت

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مادری زبان قبطی تھی، پدری زبان عبرانی تھی اور ان کے سسرال عربی زبان والے تھے۔ انہی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عربی میں کمال پیدا کیا۔ انہوں نے 137 سال عمر پائی۔ عدنان اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں اکیسویں پشت میں ہیں۔ یہ قیدار کی اولاد میں سے تھے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سلسلہ نسب بیان فرماتے تو عدنان پر پہنچ کر رک جاتے۔ آگے نہ بڑھتے۔ فرماتے تھے کہ ماہرین انساب غلط کہتے ہیں، تاہم علماء کی تحقیق کے مطابق عدنان اور حضرت ابراہیم کے درمیان چالیس پشتیں ہیں۔[1]

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے خلق کی تخلیق فرمائی تو مجھے سب سے اچھے گروہ میں رکھا، پھر

---

[1] قلب جزيرة العرب، ص: 237،230، المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 2/191-194.

ان کے بھی دو گروہوں میں سب سے زیادہ اچھے گروہ میں مجھے رکھا۔ پھر قبائل کو چنا تو مجھے سب سے اچھے قبیلے میں رکھا، پھر گھرانوں کو چنا تو مجھے سب سے اچھے گھرانے میں رکھا، لہٰذا میں اپنی ذات کے اعتبار سے بھی سب سے اچھا ہوں۔ اور اپنے گھرانے کے اعتبار سے بھی سب سے ممتاز ہوں۔[1] عدنان جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان کے بارے میں قاضی سلیمان منصور پوری فرماتے ہیں ان کا من جانب اللہ محترم ہونا اس طرح ثابت ہے کہ بخت نصر نے جب عربوں پر پہلا حملہ کیا تب ارمیا اور برخیا علیہما السلام نے بخت نصر کو بتا دیا تھا کہ عدنان کو چھوڑ کر دیگر قبائل پر حملہ کرنے کی اسے اجازت ہے، چنانچہ بخت نصر نے عدنان کو چھوڑ کر دیگر قبائل پر حملہ کیا اور انہیں اسیر کر کے لے گیا۔ ان اسیروں کو اُس نے وادی فرات میں لے جا کر آباد کیا۔ انہی لوگوں نے عرب کی قدیم سلطنت انبار کی بنیاد رکھی۔

عدنان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام ''معد'' تھا۔ ان کا نام نسب نبوی میں آتا ہے۔ دوسرے بیٹے کا نام ''وعک'' تھا انہوں نے حجاز سے اٹھ کر یمن میں اپنی سلطنت قائم کر لی تھی۔ معد کے بیٹے نزار تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا نسب ان سے ملتا ہے۔ ان کی اولاد مضر میں سے کنانہ تھے۔ کنانہ کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے۔ کنانہ سے قریش کا قبیلہ وجود میں آیا۔ ان کا نام فہر تھا۔ ان کے دور میں حسان حاکم یمن اپنی فوج لے کر مکہ معظّمہ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو گرا کر اس کا ملبہ یمن لے

[1] جامع الترمذي، حديث: 3608,3607.

جائے اور وہاں کعبہ تعمیر کرے۔ فہر نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ حسان کو شکست ہوئی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ تین سال تک قید رہا، پھر فہر نے اسے آزاد کر دیا۔ حسان یمن واپس جا رہا تھا کہ راستے میں مر گیا۔ اس فتح سے فہر کی عظمت وشوکت کا دبدبہ پورے عرب میں قائم ہو گیا۔[1]

لغت حجاز میں ''قریش'' وہیل مچھلی کو کہتے ہیں۔ یہ سمندر کا سب سے بڑا جانور ہے۔ فہر اور ان کی اولاد کو قریش اس لیے کہا جانے لگا کہ وہ عرب بھر میں تمام قبائل سے زیادہ طاقت ور اور عظیم الشان تھے۔[2] اس سے پہلے کہ قریش اور ان کے بعد کے حالات بیان کیے جائیں، تھوڑی دیر کے لیے ہم مکہ کی امارت کے حوالے سے بات کر کے دوبارہ اللہ کے رسول ﷺ کے آباء واجداد کی بات کریں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام تاحیات مکہ کے متولی رہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے نابت اور قیدار اس کے متولی بنے۔ ان کی معیشت کا دارومدار یمن اور مصر وشام کی تجارت پر تھا۔

ان کے بعد ان کے نانا مضاض بن عمرو جرہمی نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لی۔ اور مکہ کی سربراہی بنو جرہم کی طرف منتقل ہو گئی۔ ایک لمبی مدت تک وہ عملاً مکہ کے والی بنے رہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام چونکہ بیت اللہ کے بانی ومعمار تھے، اس لیے ان کی اولاد کو ایک باوقار مقام حاصل رہا۔ لیکن اقتدار واختیار میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ اس حساب سے مکہ میں قبیلہ جرہم کا وجود کوئی دو ہزار ایک سو برس تک رہا۔ ان کی حکمرانی دو ہزار

---

[1] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 227,226/2.

[2] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 227/2.

سال تک رہی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اس عرصے میں گوشہ گمنامی سے نہ نکل سکی۔ یہاں تک کہ بخت نصر کے ظہور سے کچھ پہلے بنو جرہم کی طاقت کمزور پڑ گئی۔ اور مکہ کے افق پر عدنان کا سیاسی ستارہ جگمگانا شروع ہوا۔ مکہ میں بنو جرہم کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ انہیں تنگ دستی نے آ گھیرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے زائرین بیت اللہ پر زیادتیاں شروع کر دیں۔ وہ بیت اللہ کا مال کھانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ بنو عدنان ان کی اس حالت سے سخت نالاں تھے اور ان کی حرکات پر کڑھتے رہتے تھے، چنانچہ بنو خزاعہ نے اس نفرت سے فائدہ اٹھایا، انہوں نے بنو عدنان کی حمایت سے بنو جرہم کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور دوسری صدی عیسوی کے وسط میں بنو جرہم کو مکہ سے بے دخل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ بنو جرہم نے مکہ چھوڑتے وقت زمزم کا کنواں پاٹ دیا۔

مسعودی نے لکھا ہے کہ اہل فارس پچھلے دور میں بیت اللہ کے لیے اموال اور جواہرات بھیجتے رہتے تھے۔ ساسان بن بابک نے سونے کے بنے ہوئے دو ہرن، جواہرات، تلواریں اور بہت سا سونا بھیجا تھا۔ عمرو بن حارث جرہمی نے یہ سارا مال زمزم کے کنویں میں دفن کر دیا۔ اور خود یمن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب بنو خزاعہ نے مکہ پر تنہا اپنی حکمرانی قائم کی۔ ان کا اقتدار تین سو برس تک قائم رہا۔ حتی کہ قصی بن کلاب کا ظہور ہوا۔ قصی ابھی ماں کی گود میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ نے ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی۔ اور بچے سمیت خاوند کے ساتھ شام چلی گئی۔ قصی جوان ہوئے تو مکہ واپس آئے اور ان کی شادی مکہ کے والی حُلیل خزاعی

کی بیٹی حُبّی سے ہوگئی۔ حُلیل کا انتقال ہوا تو مکہ اور بیت اللہ کی تولیت کے لیے بنو خزاعہ اور قریش میں جنگ ہوئی۔ قریش فتح یاب ہوئے اور قصی مکہ اور بیت اللہ پر قابض ہو گئے۔

قصی کا مکہ پر قبضہ اور تولیت 440ء کی بات ہے۔ انہوں نے بہت سے قابل ذکر کارنامے انجام دیے۔ حرم کعبہ کے شمال میں دارالندوہ تعمیر کیا۔ اس کا دروازہ بیت اللہ کی طرف تھا۔ یہ درحقیقت قریش کی پارلیمنٹ تھی۔ جہاں تمام اہم معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ یہاں جنگ کی تیاری بھی ہوتی۔ قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے۔ نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے تھے۔ انہوں نے سقایہ (یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا) اور رفادہ (حجاج کی ضیافت کرنا) جو خدام حرم کا سب سے بڑا منصب تھا قائم کیا۔ تمام قریش کو جمع کر کے انہیں حجاج کی خدمت اور ضیافت کے لیے تیار کیا اور ان پر واضح کیا کہ لوگ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے آتے ہیں۔ ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے۔ ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ مکرمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ انہوں نے چمڑے کے حوض بنائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قریش کا لقب انہی کو ملا تھا۔ مؤرخین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا تھا۔ ان کے چھ بیٹے تھے۔ جن میں عبدالدار اور عبد مناف نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ مرتے وقت انہوں نے تمام مناصب اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو سونپے، تاہم

عبدمناف نے اپنی خصوصیات کے باعث قریش کی سیادت حاصل کر لی۔ اور انہی کا خاندان رسول اللہ ﷺ کا خاص خاندان ہے۔ عبدمناف کے چھ بیٹے تھے۔ ان میں سے ہاشم نہایت مالدار اور بااثر تھے۔ انہوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ بنوعبدالدار سے حرم کے مناصب واپس لے لیے جائیں کیونکہ وہ لوگ اس منصب کے اہل نہیں۔ عبدالدار کے لوگوں نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بالآخر صلح ہوگئی۔ بنوعبدالدار نے سقایہ اور رفادہ بنو ہاشم کو واپس کر دیا۔[1] ہاشم اپنے قبیلے کے سردار مقرر ہوئے۔ اپنی ذمہ داری بڑی خوبی سے ادا کرتے تھے۔ انہوں نے حجاج کی خدمت اس شاندار طریقے سے کی کہ لوگ مثالیں دینے لگے۔ تجارت کو خوب ترقی دی۔ قیصر روم سے خط و کتابت کی اور اس سے یہ فرمان حاصل کر لیا کہ قریش اس کے ملک میں سامان تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ اہل عرب سردیوں میں یمن اور حبشہ کا سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں انگوریہ (موجودہ دور میں ترکی کا دارالحکومت انقرہ) ایشائے کوچک کا مشہور شہر تھا۔ یہاں روم کا بادشاہ قیصر کے لقب سے رہتا تھا۔ قریش انگوریہ جاتے تو قیصر نہایت عزت سے پیش آتا اور ان کا استقبال کرتا تھا۔ اس دور میں قافلوں کے لیے راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے مختلف قبائل کے دورے کیے اور ان سے معاہدے کیے کہ وہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ اس کے صلے میں کاروان

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/138,137 .

قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں لے کر خود بہم پہنچائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا۔ یہی سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا۔ ہاشم نے اس قحط میں روٹیوں کا چورا کر کے لوگوں کو کھلایا۔ اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا۔ عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں۔ جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔ ایک بار وہ تجارت کی غرض سے شام گئے۔ راستہ میں مدینہ ٹھہرے۔ وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا۔ بازار گئے تو ایک عورت کو دیکھا۔ اس کی حرکات وسکنات سے شرافت وفراست کا اظہار ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت حسین وجمیل بھی تھی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام سلمٰی ہے اور بنونجار سے تعلق ہے۔ اس کا والد بھی سردار قبیلہ تھا۔ ہاشم نے شادی کی درخواست کی تو قبول کر لی گئی۔ نکاح ہوگیا۔ انہوں نے مدینہ میں کچھ دیر قیام کیا۔ ہاشم وہاں سے فلسطین تشریف لے گئے۔ بعد میں سلمٰی کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام شیبہ رکھا گیا۔ ہاشم غزہ کے شہر میں مقیم تھے۔ وہیں بیمار ہوکر وفات پا گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ ادھر ان کے بیٹے شیبہ مدینہ ہی میں پرورش پاتے رہے۔ جب ان کی عمر 8 سال ہوئی تو ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا مدینہ گئے۔ بھتیجے سے ملاقات ہوئی۔ بھائی کی محبت نے جوش مارا، تین دن وہاں رہے۔ شیبہ کی والدہ سے بچے کو مکہ لے جانے کی خواہش ظاہر کی اور چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ یہی ہمارے پیارے رسول ﷺ کے دادا محترم ہیں۔ شیبہ کا

لفظی معنی بوڑھا ہے۔ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کی چندیا میں چند بال سفید تھے، اس لیے شیبہ نام رکھا گیا۔ مکہ آئے تو ان کے چچا مطلب نے بیٹوں سے بڑھ کر نازونعم سے پرورش اور تربیت کی۔ اس احسان مندی کی قبولیت اور اظہار کے طور پر یہ تمام عمر ''عبدالمطلب'' یعنی مطلب کے غلام کہلاتے رہے۔ اصلی نام پر یہ لقب اس قدر غالب آ گیا کہ عبدالمطلب ہی ان کا اصل نام سمجھا جاتا ہے۔ ان کی شہرت سید قریش کے لقب سے تھی۔ ان کا نام شیبۃ الحمد' فیاض اور مُطْعِمُ طَیْرِ السَّمَاءِ بھی آتا ہے۔ یہ بلاشبہ سید قریش تھے۔ قریش میں ان کے اس خطاب کا کوئی منکر نہ تھا۔[1]

ہاشم کے تین اور بھائی مطلب، نوفل اور عبدشمس تھے۔ اپنے باپ کے بعد جب ہاشم قوم کے سردار بنے تو ان کے بھتیجے امیہ بن عبدشمس نے ان کی سرداری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ عسقلان کا ایک کاہن منصف ٹھہرا۔ اس نے ہاشم کے حق میں فیصلہ دیا اور امیہ کو دس برس کے لیے جلاوطن ہونا پڑا۔ امیہ کو اپنے چچا ہاشم سے جو اختلاف شروع ہو گیا تھا، وہ آئندہ نسلوں میں بھی منتقل ہوا۔ ہاشم اور مطلب کی اولاد ایک جانب اور نوفل اور عبدشمس کی اولاد دوسری جانب رہا کرتی تھی۔ ان دو خاندانوں کی باہمی منافرت اور عداوت کے بیسیوں واقعات مشہور ہیں۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے وجودِ مسعود کی برکت تھی کہ نسلوں کی عداوتیں آپ کی تشریف آوری کے بعد معدوم ہو گئیں۔

---

[1] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 1/205-214.

عبدالمطلب کے کارناموں میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے زم زم کا وہ کنواں جو بنو جرہم نے بند کر رکھا تھا اور امتداد زمانہ سے کسی کو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ کنواں کہاں تھا اس کا کھوج نکالا۔ کتب تاریخ میں ہے کہ عبدالمطلب نے تین روز متواتر یہ خواب دیکھا کہ کنواں نکالو، پھر خواب ہی میں ان کو اس جگہ کی نشاندہی کی گئی۔ انہوں نے بیدار ہونے کے بعد کھدائی شروع کی۔ اس وقت ان کا ایک ہی بیٹا حارث تھا۔ کھدائی کے دوران بنو جرہم کی دفن کردہ اشیاء، یعنی سونے کے دو ہرن، تلواریں اور زرہیں برآمد ہو گئیں۔ جب زمزم کا کنواں نمودار ہو گیا تو قریش نے عبدالمطلب سے جھگڑا شروع کیا۔ اور مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی کھدائی میں شامل کرلو۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس کام کے لیے مخصوص و مامور ہوں۔ پھر بھی قریش نے اصرار کیا۔ جھگڑا ختم کرنے کے لیے بنو سعد کی ایک کاہنہ عورت کا

انتخاب ہوا کہ جو وہ فیصلہ کر دے فریقین کو منظور ہو گا۔ یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ چند ایسی علامات کا ظہور ہوا جن سے قریش سمجھ گئے کہ زمزم کا کام قدرت کی طرف سے عبدالمطلب ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اس موقع پر عبدالمطلب نے منت مانی کی اگر ان کے ہاں دس بیٹے ہوئے اور سب کے سب جوان ہو گئے تو وہ ایک بیٹے کو کعبہ کے پاس قربان کر دیں گے۔ مطلب کی وفات یمن میں ردمان کے مقام پر ہوئی تھی۔ ان کے چھوڑے ہوئے تمام مناصب عبدالمطلب کو حاصل ہوئے۔ مگر ان کے چچا نوفل نے عبدالمطلب کے صحن پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ عبدالمطلب نے قریش کے لوگوں سے مدد چاہی مگر انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے اور تمہارے چچا کے درمیان دخل اندازی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ عبدالمطلب نے مدینہ میں اپنے ننھیال کو خط لکھا اور بنونجار سے مدد طلب کی۔ ان کا ماموں ابو سعد بن عدی 80 سواروں کے ساتھ مکہ آیا۔ عبدالمطلب نے کہا کہ ماموں جان گھر تشریف لے چلیں۔ مگر ابو سعد نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم! پہلے میں نوفل کا سامنا کروں گا۔ وہ حطیم میں مشائخ قریش کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ابو سعد اس کے سر پر کھڑا ہو گیا، اس نے تلوار بے نیام کی اور کہا کہ اس گھر کے رب کی قسم! اگر تم نے میرے بھانجے کی زمین واپس نہ کی تو تمہارے بدن میں یہ تلوار گھونپ دوں گا۔ نوفل نے کہا: مطمئن ہو جاؤ۔ میں نے زمین واپس کر دی۔ ابو سعد نے قریش کو گواہ بنایا۔ مکہ میں تین دن ٹھہرا اور عمرہ ادا کر کے مدینہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد نوفل نے بنو عبد شمس سے بنو ہاشم کے خلاف باہمی تعاون کا سمجھوتہ کیا۔

ادھر عبدِ مناف کی ماں قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح بنونجار نے عبدالمطلب کی مدد کی ہے۔ ہمارا بھی اس کی مدد کرنے کا حق ہے کہ یہ بھی ہماری اولاد ہے، چنانچہ بنوخزاعہ نے دارالندوہ جا کر بنوعبد شمس اور بنونوفل کے خلاف تعاون کا عہد و پیمان کیا جو آگے چل کر فتح مکہ میں مسلمانوں کے کام آیا۔ [1]

سردار عبدالمطلب کے دور میں ابرہہ حبشی نے بیت اللہ کو ڈھانے کا پروگرام بنایا۔ یہ واقعہ بڑا معروف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابرہہ نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر جنرل تھا۔ اس نے دیکھا کہ اہل عرب بیت اللہ کا حج کرتے ہیں، دیکھا دیکھی اس نے بھی صنعاء میں ایک بہت بڑا کلیسا بنوایا۔ اس کی خواہش تھی کہ عرب کے حج کا رخ اسی کی طرف پھر جائے۔ یہ خبر بنوکنانہ کے ایک آدمی کو ہوئی تو اس نے اس کلیسا میں رفع حاجت کر ڈالی۔ ابرہہ کو سخت غصہ آیا۔ اس نے ساٹھ ہزار کا لشکر جرار لے کر بیت اللہ پر چڑھائی کر دی۔ اس کے لشکر میں 9 یا13 ہاتھی تھے۔ اسی لیے ان کو اصحاب فیل کہا گیا۔ جب یہ لشکر لے کر طائف کے قریب پہنچا تو بنو ثقیف نے راستہ بتانے کے لیے ابو رغال نامی ایک آدمی اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکہ تین میل دور رہ گیا تو ابو رغال راستہ ہی میں مرگیا۔ ابرہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کے فوجیوں کو آگے بڑھایا انہوں نے اہل تہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لیے۔ ان میں سردار عبدالمطلب کے بھی دوسو اونٹ شامل تھے۔ بیت اللہ کو ڈھانے کی خبر جب اہل مکہ کو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ہم میں ابرہہ سے

---

[1] مختصر سیرۃ الرسول للشیخ محمد بن عبدالوہاب، ص:42,41۔

لڑنے کی طاقت نہیں۔ یہ اللہ کا گھر ہے وہ چاہے تو اپنے گھر کو بچا لے۔ ادھر ابرہہ نے اپنا ایلچی بھجوایا کہ میری اہل مکہ سے کوئی لڑائی نہیں میں تو صرف بیت اللہ کو ڈھانے آیا ہوں۔ ایلچی کے کہنے پر سردار عبدالمطلب کی ابرہہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ انہیں دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا وہ اپنے تخت سے اتر کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: آپ اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں مگر یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دین کا مرجع ہے اس کی کوئی بات نہیں کر رہے؟ انہوں نے کہا: میں اونٹوں کا مالک ہوں۔ اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر تو اس کا ایک رب ہے۔ وہ اس کی خود حفاظت کرے گا۔ ابرہہ نے کہا کہ وہ اس کو مجھ سے بچا نہ سکے گا۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ آپ جانیں اور وہ جانے۔ عبدالمطلب نے یہ بھی کہا: یہ اللہ کا گھر ہے۔ آج تک اس نے کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ ابرہہ نے ان کے اونٹ واپس کر دیے۔

اہل مکہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ عبدالمطلب نے چند سرداروں کو ساتھ لیا اور حرم میں اللہ سے بیت اللہ کی حفاظت کی دعائیں مانگیں۔ اللہ تعالیٰ نے لشکر کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ارسال کر دیے جو اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے تھے۔ انہوں نے لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس سے سارا لشکر ہلاک ہو گیا۔ [1]

جس سال یہ واقعہ پیش آیا اہل عرب اسے عام الفیل کہتے ہیں۔ اسی سال اللہ

---

[1] البدایۃ والنھایۃ: 2/181-190.

کے رسول ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی۔ اصحاب الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا جبکہ اس کے 50 دن کے بعد ربیع الاول کے مہینہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی ولادت با سعادت ہوئی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ نے اسلام یا کفر یا کسی اور خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی، یعنی ابولہب، ابو طالب، عبداللہ، حمزہ اور عباس۔ عام طور پر مشہور ہے کہ ابولہب لوگوں کا دیا ہوا لقب ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین وجمیل تھا اور عرب میں گورے چہرے کو شعلۂ آتش کہتے ہیں، فارسی میں آتشِ رخسار کہا جاتا ہے۔ عبدالمطلب نے منت مانی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ اللہ نے آرزو پوری کی۔ وہ بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے۔ پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو۔ دیکھو کس کا نام نکلتا ہے۔ اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا۔ یہ انہیں لے کر قربان گاہ چلے گئے۔ عبداللہ کی بہنیں ساتھ تھیں۔ وہ رونے لگیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کے بدلے دس اونٹ قربان کیجیے۔ انہیں چھوڑ دیجیے۔ عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو۔ اتفاق سے پھر عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ اب دس کی بجائے بیس اونٹ کر دیجیے۔ یہاں تک بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ نکل آیا۔ سردار عبدالمطلب نے سو اونٹ قربان کیے اور عبداللہ بچ گئے۔

اس واقعہ سے پہلے عرب میں انسانی دیت (خون بہا) کے لیے دس اونٹ مقرر تھے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد دیت کی مقدار عام طور پر سو اونٹ ہو گئی۔ گویا عبدالمطلب کے خلوص اور سردار عبداللہ کی اطاعت پدر کا یہ نتیجہ نکلا کہ سارے علاقے میں انسان کی قدر و قیمت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ دیت کی مقدار میں دس گنا اضافہ سے وارداتِ قتل میں بہت نمایاں کمی ہو گئی ہو گی۔ اس طرح یہ واقعہ تمام جزیرہ عرب اور بنی نوع انسان کے لیے خیرات و برکات کا موجب بن گیا۔

بلاشبہ جس گراں قدر سردار کے فرزند کو رحمت للعالمین ﷺ بننا تھا اس کے آباء کا بھی بنی نوع انسان کے لیے ایسا ہی محسن ہونا ضروری تھا۔

عبداللہ قربانی کی زد سے بچ گئے تو والد کو شادی کی فکر ہوئی۔ امام ابن کثیر نے متعدد حوالوں سے لکھا ہے کہ کئی عورتیں عبداللہ سے شادی کی آرزومند تھیں۔ ان میں ورقہ بن نوفل کی بہن ام قتال اور فاطمہ نامی ایک کاہنہ بھی شامل تھیں۔ بلکہ فاطمہ نے تو انہیں سو اونٹوں کی پیش کش بھی کی۔ مگر عبداللہ نے اس کے جواب میں دو شعر سنائے اور اپنے والد کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ میں محترم قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھا ہے کہ فاطمہ نے ان سے اظہار محبت کیا اور اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے سو اونٹوں کا عطیہ بھی دینا چاہا۔ اس کے جواب میں سردار عبداللہ نے جو اشعار پڑھے ان کا ترجمہ بھی بڑا عمدہ ہے جو سردار عبداللہ کے خاندانی پس منظر اور شرافت و نجابت کا اظہار و اعلان کرتا ہے۔ عبداللہ نے جو اشعار

پڑھے، اُن کا ترجمہ یہ ہے:

''فعل حرام کے ارتکاب سے تو مر جانا ہی اچھا ہے۔ حلال کو بے شک پسند کرتا ہوں۔ مگر اس کے لیے اعلان ضروری ہے۔ تم مجھے بہکاتی اور پھسلاتی ہو مگر شریف آدمی کو لازم ہے کہ وہ اپنی عزت اور دین کی حفاظت کرے۔''

ام قتال نے دیکھا کہ عبدالمطلب اور عبداللہ دونوں باپ بیٹے کہیں جا رہے ہیں۔ اس نے عبداللہ سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ بولے مجھے میرے والد ساتھ لیے جا رہے ہیں جہاں بھی یہ لے جائیں گے میں وہیں چلا جاؤں گا۔ ام قتال کہنے لگی: کیا تم قربانی کے اونٹ ہو کہ تمہاری نکیل پکڑ کر جو چاہے اور جہاں چاہے، لے جائے۔ عبداللہ نے جواب دیا: یہ میرے والد ہیں۔ میں ان کی حکم عدولی کر سکتا ہوں نہ ان سے جدائی برداشت کر سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے والد کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ انہیں وہب بن عبد مناف بن زہرہ کے پاس لے گئے، جو ان دنوں اپنے قبیلے بنو زہرہ کے سردار تھے۔ ان سے درخواست کی کہ وہ عبداللہ کو اپنی فرزندی میں لے لیں، یعنی اپنی بیٹی آمنہ سے ان کی شادی کر دیں۔ چونکہ دونوں خاندانوں کا تعلق بنو اسماعیل سے تھا، اس لیے وہب بن عبد مناف نے نہایت خوش دلی سے یہ رشتہ منظور کیا اور عقد ہو گیا۔ سیدہ آمنہ اپنے قبیلے میں سیدۃ النساء کہلاتی تھیں۔

اس موقع پر خود سردار عبدالمطلب نے سیدہ آمنہ کے چچا کی بیٹی ہالہ بنت وہیب سے شادی کی۔ حضرت حمزہ اور سیدہ صفیہ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں۔ اس بنا پر حضرت

حمزہ آپ ﷺ کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ [1]

اس وقت عرب میں یہ دستور تھا کہ دولہا شادی کے بعد 3 دن تک سسرال ہی میں رہتا تھا، اسی کے مطابق عبداللہ بھی تین روز یثرب میں رہے۔ پھر گھر چلے آئے۔ اس وقت ان کی عمر 25 سال کی تھی۔ سیدہ آمنہ نکاح کے بعد پہلے ہی ہفتہ میں امانت دارِ نورِ نبوت بن گئیں۔ ان کو خواب میں بتایا گیا کہ اپنے بیٹے کا نام احمد رکھنا، چنانچہ والدہ نے آپ ﷺ کا نام احمد رکھا اور دادا نے محمد تجویز کیا۔ دونوں مبارک نام اللہ کے رسول ﷺ کے ذاتی نام ہیں۔ اس خواب کے بعد سیدہ آمنہ کو یقین ہو گیا کہ ان کا فرزند نہایت مبارک و مسعود ہوگا، چنانچہ جب حلیمہ سعدیہ نے اللہ کے رسول ﷺ کو گود میں لینے سے اس لیے تامل کیا کہ وہ یتیم بچے ہیں تو سیدہ نے فرمایا تھا: اے دایہ! اس بچے سے مطمئن رہو، اس کی شان بہت بُلند پایہ ہونے والی ہے۔

سردار عبداللہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ملک شام تجارت کے لیے تشریف لے گئے۔ واپسی پر یثرب میں ٹھہر گئے کہ ان کے والد نے حکم دیا تھا کہ وہاں کھجوروں کا سودا کریں۔ وہیں بیمار ہوئے اور عالم آخرت کو سدھار گئے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے والدین کے اسمائے گرامی پر غور کیجیے۔ والد عبداللہ ہیں، والدہ آمنہ ہیں۔ اس دور کی تاریخ پر ذرا نظر دوڑائیں، ہر ذی شعور تعجب کرے گا کہ ایسے پاک نام کیوں کر رکھے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی دلائل نبوت میں

[1] البدایۃ والنھایۃ: 265،264/2.

سے ہے کہ جس بچے کو باپ کے خون سے عبودیت الٰہی اور ماں کے دودھ سے امن عامہ کی گھٹی ملی ہو کچھ تعجب نہ کریں کہ وہ محمود الافعال اور حمید الصفات ہو۔ اور ساری دنیا کی زبان سے محمد کہلائے ﷺ۔

جب سردار عبداللہ کا انتقال ہوا ہمارے پیارے رسول ﷺ ابھی شکم مادر ہی میں تھے۔ عبداللہ کی وفات کی خبر مکہ پہنچی تو سردار عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر کی تصدیق کے لیے مدینہ بھیجا۔ عبداللہ انتقال کر چکے تھے۔ چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ عزیز تھے، اس لیے تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔ سیدہ آمنہ نے ان کی وفات پر بڑا دردانگیز مرثیہ کہا۔

عبداللہ نے ترکہ میں پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔ اُس کا نام ام ایمن تھا۔ یہ سب چیزیں اللہ کے رسول ﷺ کو ترکہ میں ملیں۔ ام ایمن کا اصل نام برکت تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو گود میں کھلایا تھا، اللہ کے رسول ﷺ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے: ''أُمِّي بَعْدَ أُمِّي'' یعنی میری والدہ کے بعد یہ میری ماں ہیں۔ ان کے مکان پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان کا پہلا نکاح عبید احبشی سے ہوا تھا، اس سے ایمن پیدا ہوا۔ دوسرا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا ان سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ اسامہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی اپنی خلافت کے ایام میں ام ایمن کی زیارت کے لیے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔[1]

---

[1] أسد الغابة: 291/9.

5

ولادت باسعادت

آپ ﷺ کی ولادت باسعادت نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی پوری مخلوقات کے لیے باعث رحمت و سعادت تھی۔ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب بیان کرتی ہیں: جب آپ ﷺ کی ولادت ہوئی تو میرے جسم سے ایک نور نکلا جس سے ملک شام کے محلات روشن ہو گئے۔[1] ایوان کسریٰ کے چودہ کنگورے گر گئے۔ مجوس کا آتش کدہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بحیرہ ساوہ خشک ہو گیا اور اس کے اردگرد کے گرجے منہدم ہو گئے۔[2]

آپ ﷺ کے والد کا نام عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم تھا وہ ہاشمی اور قریشی تھے۔ کائنات کے افضل ترین قبیلہ سے تعلق تھا۔ ان کے جد امجد حضرت

---

[1] مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ، ص: 12.

[2] مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ، ص: 12 لیکن اس روایت میں کلام ہے۔

اسماعیل علیہ السلام بن ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے۔ پیدائش سے چند ماہ پہلے ہی جناب عبداللہ وفات پا چکے تھے۔ ان کا نسب نہایت پاکیزہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس گھرانے میں کوئی بچہ نکاح کے بغیر پیدا نہیں ہوا[1]۔ عبداللہ اپنے والد عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور سب سے لاڈلے صاحبزادے تھے۔ عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے۔

باپ کو یوں تو ساری اولاد سے محبت ہوتی ہے مگر عبدالمطلب کو عبداللہ سے غیر معمولی محبت تھی۔ جب عبداللہ کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو ان کی شادی عرب کی نہایت معزز و محترم خاتون آمنہ بنت وہب بن عبد مناف سے کر دی۔ یہ قریشی خاتون تھیں ان کے والد بنو زہرہ کے سردار تھے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یتیم پیدا ہوئے۔ اپنے والد کا پیار، محبت اور شفقت نہ پا سکے۔ مگر براہ راست سماوی نگرانی میں ایک بڑے کام، ایک بڑی ذمہ داری کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بچپن سے تربیت کی گئی۔ کائنات کی افضل ترین شخصیت صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالِ جہاں تاب 9 ربیع الاول کو بمطابق پیر 20 اپریل 571ء کے دن صبح صادق کے وقت اس دنیا میں طلوع ہوا۔ واقعہ فیل کو پچاس دن گزر چکے تھے۔ ولادت شِعب بنی ہاشم میں ابو طالب کے گھر ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی والدہ شفا نے دایہ کے فرائض انجام دیے۔

ولادت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے دادا کی خدمت میں پوتے کی خوشخبری بھجوائی۔ دادا عبدالمطلب خوشی سے پُھولے نہ سمائے۔ پوتے کو گود میں لیا،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: 2/270.

خانہ کعبہ پہنچے اور دُنیا کے مسعود ترین نومولود کی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی، اس کا شکر ادا کیا۔ بڑی محبت سے ''محمد'' نام تجویز کیا۔ آپ کے اور بھی بہت سے نام ہیں جن میں ''احمد'' زیادہ مشہور ہے۔ حدیث شریف میں عاقب (سب سے پیچھے آنے والا) حاشر (جن کے قدموں پر مخلوق کو حشر میں اکٹھا کیا جائے گا) ماحی (کفر و شرک کو مٹانے والا)۔ اور دیگر نام بھی آئے ہیں۔ کنیت بڑے بیٹے کے نام پر ابو القاسم ﷺ تھی۔ سبحان اللہ! محمد ﷺ کتنا پیارا نام ہے۔ اس کے معنی ہیں: دنیا میں سب سے زیادہ تعریف کیا گیا۔[1] شاعر اسلام سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

وَشَقَّ لَهٗ مِنِ اسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ
فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُودٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٗ

''اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی عزت بڑھانے کے لیے ان کا نام اپنے نام سے نکالا، چنانچہ عرش والا ''محمود'' ہے تو پیغمبر ''محمد'' ہے۔''[2]

عربوں کے ہاں حرب، صخر، حمزہ، طلحہ جیسے نام مشہور تھے۔ مگر یہ اللہ کی قدرت اس کی شان اور اُسی کی مرضی تھی کہ نام مبارک ''محمد ﷺ'' رکھا گیا۔

اور بلاشبہ اس کائنات میں جتنی تعریف اور جتنا چرچا محمد ﷺ کے بے مثل محاسن کا ہوا ہے اتنا کسی اور بشر کا نہیں ہوا۔

---

[1] البدایۃ والنھایۃ: 2/266-267.

[2] البدایۃ والنھایۃ: 2/279، وسبل الھدی والرشاد: 1/408.

خانہ کعبہ کے سائے تلے عبدالمطلب کے لیے ایک قالین کا ٹکڑا بچھا دیا جاتا تھا جس پر احتراماً ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں بیٹھتا تھا۔ ایک دن چھوٹی سی عمر میں محمد ﷺ آئے اور آ کر قالین پر بیٹھ گئے۔ سردار عبدالمطلب کی اولاد نے اٹھانا چاہا۔ انھوں نے انکار کیا۔ دوبارہ بیٹھ گئے۔ انھوں نے پھر منع کیا، شدت اختیار کی، ادھر عبدالمطلب نے دیکھ لیا۔ اولاد کو منع کیا کہ اس مبارک بچے کو نہ اٹھاؤ۔[1] اور بے اختیار کہنے لگے:

وَالْبَيْتُ ذُوالْحُجُبِ وَالنُّصُبِ وَالشُّهُبِ

إِنَّ ابْنِي هٰذَا السَّبَبُ مِنَ السَّبَبِ

''یہ گھر پردوں والا، مرتبے اور جاہ والا ہے۔ اس کی عظمت کے اسباب میں سے ایک سبب میرا یہ بیٹا بھی ہے۔''[2]

[1] البدایۃ والنھایۃ: 294/2.

[2] رحمۃ للعالمین، ص: 21.

6
بنو سعد کی فضاؤں میں

اہل عرب اپنے بچوں کو شہری کثافتوں سے دور رکھنے کے لیے دودھ پلانے والی بدوی عورتوں کے حوالے کر دیتے تھے تا کہ جسم طاقتور رہے اور اعصاب مضبوط ہوں نیز بچپن ہی سے خالص اور فصیح عربی زبان سیکھ لیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کائنات میں سب سے بڑھ کر قادر الکلام تھے۔ خطاب فرماتے تو فصاحت و بلاغت کے گوہر والماس لٹا دیتے تھے۔ آپ سے بہتر کوئی خطیب نہ تھا۔ وہ بلا تردد رکے بغیر گھنٹوں لوگوں سے خطاب فرماتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ افراد سے خطاب فرمایا۔ صحابۂ کرام کہتے ہیں کہ ہم اپنے خیموں میں تھے تمام افراد تک آپ کی آواز پہنچی اور سب نے خطبہ سماعت کیا۔

ایک مؤرخ کہتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے لوگ بالعموم دیہات میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت بھی عموماً شہروں کی بجائے دیہی علاقوں میں ہوئی۔ آزاد فضا،

شفاف ہوا، اور صاف ستھرے ماحول کا اپنا مزا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی پرورش بنوسعد میں ہوئی ۔ طائف کے قرب و جوار کا علاقہ اس لحاظ سے تاریخی علاقہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنا بچپن یہاں بسر فرمایا ہے۔حلیمہ سعدیہ بنت ابی ذؤیب بنو سعد کی کچھ عورتوں اور خاوند کے ساتھ مکہ آئیں تاکہ دودھ پلانے کے لیے بچہ حاصل کریں۔تمام عورتوں کو کوئی نہ کوئی بچہ مل گیا۔حلیمہ سے محمد کو دودھ پلانے کے لیے کہا گیا مگر انھیں ایسے امیر گھرانوں کے بچوں کی تلاش تھی جہاں سے اچھا معاوضہ مل سکے۔حلیمہ نے سوچا کہ ایک یتیم کے گھر والے کیا معاوضہ دیں گے۔یہی وجہ تھی کہ کوئی عورت اس بچہ کو گود لینے پر راضی نہ تھی۔قافلہ کے جانے کا وقت ہو چکا تھا۔حلیمہ نے اپنے خاوند سے مشورہ کیا اور کہا کہ مجھے خالی ہاتھ واپس جانا اچھا نہیں لگ رہا۔ کیوں نہ میں جا کر اسی یتیم بچہ کو لے آؤں؟۔شوہر نے کہا: کوئی حرج نہیں۔ممکن ہے اللہ اسی میں ہمارے لیے برکت دے دے، چنانچہ حلیمہ نے محمد ﷺ کو اپنی گود میں لے لیا۔[1]

[1] البدایۃ والنھایۃ: 286/2.

7

بُلندی پہ میرا نصیب آ گیا!

اماں حلیمہ سعدیہ بیان کرتی ہیں: ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ میری گدھی خستہ حال تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ قافلے میں سب سے پیچھے رہتی تھی۔ مگر اب اس کی شان ہی نرالی ہوگئی۔ اللہ کی قسم! وہی مریل گدھی جو پہلے دھیمی دھیمی چلتی تھی، اب سارے قافلے کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی اور کوئی سواری اس کی برابری نہ کر سکی۔ میری سہیلیاں مجھ سے کہنے لگیں: او ابوذویب کی بیٹی! اری یہ کیا ہوگیا؟ یہ تیری وہی گدھی تو ہے جس پر تو سوار ہو کر آئی تھی۔ کہیں سواری تو نہیں بدل گئی؟۔
قارئین کرام! اصل بات یہ تھی کہ سواری نہیں سوار بدل گیا تھا۔ اماں حلیمہ بیان کرتی ہیں ہمارے علاقے بنو سعد میں قحط سالی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اللہ کی زمین کا کوئی خطہ ہمارے علاقے سے زیادہ کنگال اور قحط زدہ ہوگا۔ مگر میری بکریاں چرنے جاتیں تو واپسی پر بہت آسودہ حال اور دودھ سے بھرپور واپس آتی تھیں۔

میرا اپنا بچہ بھوک سے اس قدر بلکتا تھا کہ ہم رات بھر سو نہ سکتے تھے۔ نہ میرے سینے میں بچہ کے لیے دودھ ہوتا تھا۔ مگر جب میں محمد کو لے کر آئی اور اسے اپنی آغوش میں رکھا تو اس نے جس قدر چاہا شکم سیر ہو کر دودھ پیا۔ اس کے رضاعی بھائی نے بھی شکم سیر ہو کر دودھ پیا، پھر دونوں سو گئے۔ میرا خاوند اونٹنی کا دودھ دوہنے گیا تو اس کے تھن بھی دودھ سے لبریز تھے۔ اس نے اتنا دودھ دیا کہ ہم دونوں نے خوب آسودہ ہو کر پیا۔ صبح ہوئی تو میرا شوہر کہنے لگا: حلیمہ! خدا کی قسم! تم نے بڑی بابرکت روح حاصل کی ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ [1]

اللہ کے رسول ﷺ کے رضاعی والد کا نام حارث بن عبدالعزیٰ تھا۔ ان کی کنیت ابو کبشہ تھی۔ سرداران قریش اللہ کے رسول ﷺ کو بعد از رسالت مذاق اور تحقیر کے طور پر ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔ [2] جب اللہ کے رسول ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں کو خطوط ارسال فرمائے تو ان میں روم کے بادشاہ ہرقل کو بھی خط لکھا۔ جس میں اسے اسلام لانے کی دعوت دی تھی اور نہ ماننے کی صورت میں وعید سنائی تھی۔ جب آپ ﷺ کا مکتوب گرامی اس کے پاس پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ ہرقل نے اسے اپنے لیے چیلنج تصور کیا اور اپنے وزراء، امراء، پادری اور دانشور اکٹھے کیے۔ ان سے مشورہ کیا اور ابوسفیان جو تجارت کی غرض سے وہاں موجود تھا اس سے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کم و بیش دس سوالات کیے۔ ابوسفیان دربار سے نکلا تو کہنے لگا: **لَقَدْ أَمِرَ أَمْرُ ابْنِ أَبِي**

[1] البدایۃ والنھایۃ: 286/2۔
[2] الإصابۃ: 165/4۔

كَبْشَةَ إِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ ابوکبشہ کے بیٹے کا معاملہ بڑا زور پکڑ گیا ہے۔ اس سے تو بنو اصفر (رومیوں) کا بادشاہ بھی ڈرنے لگا ہے۔[1]

جب آپ ﷺ کی عمر مبارک دو سال ہوئی تو حلیمہ سعدیہ نے دودھ چھڑا دیا اور آپ ﷺ کو مکہ لے آئیں۔ والدہ ماجدہ سے ملاقات کرائی۔ جن برکات کا ظہور وہ اس بچے کے دم قدم سے دیکھ چکی تھیں ان کی بنا پر اُن کی خواہش تھی کہ بچہ کچھ مدت اور ان کے پاس رہے، چنانچہ انھوں نے سیدہ آمنہ سے درخواست کی کہ بچے کو میرے پاس ہی رہنے دیں تاکہ ذرا مضبوط ہو جائے۔ مجھے اس کے بارے میں مکہ کی وبا کا خطرہ ہے۔ غرض اماں حلیمہ کے اصرار پر بچے کو واپس بنو سعد میں لے جانے کی اجازت مل گئی۔ اماں حلیمہ کہتی ہیں کہ دیگر بچوں کے مقابلے میں محمد خاصے مضبوط اور توانا ہو چلے تھے۔ اس دوران آپ اپنے ایک رضاعی بھائی عبداللہ اور دو بہنوں انیسہ اور شیما (شیما کا نام حذافہ یا جذامہ تھا) کے ساتھ بکریاں چراتے رہے کہ ایک دن بڑا عظیم واقعہ رونما ہوا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو لٹایا۔ سینہ چاک کر کے دل نکالا، پھر دل سے ایک لوتھڑا نکال پھینکا اور کہا: یہ شیطان کا حصہ تھا، پھر دل کو ایک طشت میں زمزم کے پانی سے دھویا اور جوڑ کر دوبارہ اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔ اب شیطان آپ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ دوسرے

[1] صحیح البخاري، حدیث: 7.

بچوں نے جب حلیمہ کو واقعہ بتایا وہ دوڑتی ہوئی آئیں۔ آپ ﷺ کا رنگ فق تھا۔ اس واقعے کے بعد حلیمہ کو خطرہ محسوس ہوا اور انھوں آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی والدہ محترمہ کے حوالے کر دیا۔ آپ چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ ہی کے پاس رہے۔[1]

آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی اور بچپن بڑے عجیب و غریب اتفاقات میں گزرا۔ والد کی شکل تک نہ دیکھی[2] جب ذرا بڑے اور سمجھ دار ہوئے تو والدہ چل بسیں۔[3] اب دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش شروع کی۔ بڑی محبت سے پالا مگر آٹھ سال کے ہوئے تو وہ بھی داغ مفارقت دے گئے۔[4] اب چچا ابو طالب نے کفالت کی ذمہ داری سنبھالی مگر جب مشکل ترین دور شروع ہوا تو وہ بھی انتقال کر گئے۔ ان کے اُٹھ جانے کے معًا بعد دکھ اور سکھ کی ساتھی اپنی جان اور مال نچھاور کرنے والی رفیقہ حیات خدیجۃ الکبریٰ نے بھی جنت الفردوس کی راہ لی۔[5] بعض علماء کرام نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اللہ نے اپنے سوا تمام سہارے ختم کر دیے۔ صرف رب العزت کے ساتھ تعلق اور اسی کا سہارا باقی رہ گیا۔

---

1. صحیح مسلم، حدیث: 162، والبدایۃ والنھایۃ: 2/287.
2. مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب، ص: 18.
3. مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب، ص: 21.
4. أیضا، ص: 21.
5. مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب، ص: 152.

8

مدینہ منورہ میں بنو نجار بڑا مشہور اور اہم قبیلہ تھا۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے والد کے ننھیال تھے۔ اب ہم ذرا پیچھے پلٹتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے پردادا ہاشم بن عبد مناف جن کی نسبت سے آپ ہاشمی کہلاتے ہیں، ایک مرتبہ تجارت کے لیے شام تشریف لے گئے۔ راستے میں مدینہ پہنچے تو وہاں بنو نجار کی ایک نیک نام خاتون سلمٰی بنت عمرو سے شادی کر لی۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرے اور بیوی کو حالت حمل میں میکے ہی میں چھوڑ کر شام روانہ ہو گئے اور فلسطین کے شہر غزہ میں انتقال کر گئے۔ ادھر سلمٰی کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ بچے کے سر کے بالوں میں سفیدی تھی، اس لیے اس کا نام شیبہ رکھا گیا۔[1] یہی بچہ آگے چل کر عبدالمطلب کے نام سے معروف ہوا۔ یہی اللہ کے رسول ﷺ کے دادا محترم تھے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو انصار کے قبائل تلواریں حمائل

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/137-138.

کیے اللہ کے رسول کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ ان میں آپ کا ننھیالی قبیلہ بنو نجار پیش پیش تھا۔ جس جگہ آج مسجد نبوی ہے یہ بنو نجار کا محلّہ تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاری کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔[1] آپ ﷺ کی والدہ آپ ﷺ کو اپنے ننھیال سے ملانے اور اپنے متوفی شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے اپنی خادمہ ام ایمن اور اپنے سر پرست عبدالمطلب کی معیت میں کوئی پانچ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے مدینہ تشریف لے گئیں۔ وہاں ایک ماہ قیام رہا۔ واپسی ہوئی تو راستے میں بیمار ہو گئیں۔ اور ابواء نامی بستی میں پہنچ کر رحلت فرما گئیں۔[2] بعد میں اللہ کے رسول ﷺ جب ابواء سے گزرے تو اللہ تعالیٰ سے والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت طلب کی۔ جو عطا کی گئی۔ آپ خود بھی روئے اور جو ساتھ تھے وہ بھی روئے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اِسْتَأْذَنْتُ رَبِّي أَنْ أَسْتَغْفِرَ لأمّي فَلَمْ يُؤْذَنْ لِي واسْتَأْذَنْتُهُ أَنْ أَزُورَ قَبْرَهَا فأذِنَ لِي)۔

"میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کے لیے مغفرت طلب کرنے کی اجازت مانگی تو نہ مل سکی اور اُن کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت دے دی گئی۔"[3]

---

[1] مختصر سیرۃ الرسول، ص:229، والرحیق المختوم 241،240۔

[2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 168/1۔

[3] صحیح مسلم، حدیث:976۔

آپ ﷺ کی والدہ محترمہ کی وفات کے بعد بوڑھے عبدالمطلب اپنے یتیم پوتے کو لے کر مکہ واپس آئے۔ اور کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ پوتے سے بے حد محبت کرتے، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ وہ بلاشبہ اپنی قوم کے بہت بڑے سردار تھے۔

9

کائنات کی منفرد شخصیت

بعثت سے پہلے بھی اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی بڑی متواضع اور سادہ تھی۔ انتہائی فاسد ماحول میں پلنے کے باوجود ان کی جوانی بے داغ تھی۔ جہاں گلی گلی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی ہوں، گھر گھر شراب خانے کھلے ہوں اس ماحول میں اس جداگانہ امتیازی فطرت کے حامل فردِ فرید نے کبھی شراب کا ایک قطرہ بھی اپنی زبان کے نزدیک نہیں آنے دیا۔ انھوں نے شطرنج کے مہروں کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ان کے والد عبداللہ اس دنیا سے درہم و دینار چھوڑ کر رخصت نہیں ہوئے۔ صرف پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ اور ایک حبشیہ لونڈی چھوڑی۔ ان کا نام برکت اور کنیت ام ایمن تھی۔ یہی ام ایمن ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو گود میں کھلایا تھا۔ آپ ﷺ کے پاس کپڑوں کے زیادہ جوڑے نہ تھے۔ صرف ایک جوڑا تھا جسے دھو کر پہن لیتے تھے۔ اس کے باوجود آپ کا جسم مبارک ریشم و دیباج

سے بھی زیادہ نرم و نازک تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کا شرف حاصل کیا۔ اللہ کی قسم! میں نے اللہ کے رسول کی ہتھیلی کو ریشم و دیباج سے بھی زیادہ نرم پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر سے نکلنے والے پسینہ کی تعریف میں حضرت انس فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں نے اس کی خوشبو کستوری اور عنبر سے بھی عمدہ اور بہتر پائی۔ [1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت والد کے بعد شفیق چچا ابو طالب نے کی۔ وہ بھی مالدار نہ تھے۔ بچپن میں ہر نبی کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بکریاں چرائیں۔ نہایت معمولی اجرت کے عوض عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چراتے رہے۔ اہل علم نے بکریاں چرانے کی حکمتیں بیان کی ہیں۔ بکریاں چَرانے سے دل میں نرمی، تواضع اور انکسار پیدا ہوتا ہے۔ اس سے لوگوں کی سیاست، اور معاملات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بہترین اور پاکیزہ کمائی ہے۔ اس میں کسی قسم کا دھوکا یا فراڈ شامل نہیں ۔ نہ اس میں کوئی سود کی لعنت ہوتی ہے۔ پھر اللہ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو غنی کر دیا۔ سورۂ والضحیٰ میں ارشاد ہوا:

﴿ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝ وَوَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰی ﴾

’’کیا اس نے آپ کو یتیم پا کر ٹھکانا نہیں دیا اور آپ کو جویائے راہ پا کر

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:3561، وصحیح مسلم، حدیث:2330.

ہدایت نہیں دی اور آپ کو تنگدست پا کر تونگر نہیں کر دیا۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپ نے 63 سال کی زندگی گزاری۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سب سے اعلیٰ، ارفع اور بہترین دلیل یہ ہے کہ آپ نے ساری زندگی ایک دفعہ بھی جھوٹ نہیں بولا۔ ساری زندگی خیانت کے کبھی مرتکب نہ ہوئے۔ کبھی فحش گوئی نہیں کی۔ زبان پر مکمل کنٹرول تھا۔ لسانِ مبارک سے کبھی کوئی غلط بات نہیں نکلی۔ نبوت سے پہلے بھی آپ کی اعلیٰ عادات اور خصائل بڑے منفرد اور بے مثل تھے۔..... زمانۂ جاہلیت کے انتہائی گمراہ ماحول میں آپ کی بے مثال پاکیزہ زندگی دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس ظلمت کدہ میں چودہویں کے چاند کی طرح جگمگا رہا ہے۔

بچپن

بچپن کی خصوصیات میں ایک خصوصیت آپ کی یہ بھی تھی کہ آپ دوسرے بچوں کی طرح حریص اور طماع نہ تھے۔ آپ بچپن ہی سے قناعت پسند تھے۔ گھر کے دوسرے بچے جب صبح کو بیدار ہوتے تو شکم سیری کی وجہ سے پریشان اور آلودہ چشم نظر آتے تھے' لیکن آپ کم خوری کے باوجود نہایت مسرور' بیدار مغز اور سرمگیں چشم دکھائی دیتے تھے۔

دنیائے اخلاق میں شرم وحیا بہت قیمتی چیز ہے اور یہ اس خصلت کا نام ہے جو شرافت وانسانیت کی نظر میں معیوب چیزوں کو روکے۔ سرکار دو عالم ﷺ بچپن ہی سے شرم وحیا کے پیکر تھے روایات میں ہے کہ تعمیر کعبہ کے موقع پر جب آپ پتھر اٹھا رہے تھے تو آپ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ جو آپ سے صرف دو سال بڑے تھے' انہوں نے دیکھا کہ پتھروں سے ان کے معصوم بھتیجے محمد ﷺ کے مونڈھے

چھلے جا رہے ہیں۔ اس زمانے کے عربوں میں آج کل کے یورپ کی طرح برہنگی کوئی معیوب شے نہیں تھی۔ وہ تو خانہ کعبہ کا طواف بھی مادر زاد برہنہ ہو کر کرتے تھے۔ اس وجہ سے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے پر ترس کھاتے ہوئے ارادہ کیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لنگی کھول کر ان کے مونڈھے پر رکھ دیں تاکہ پتھروں کے اٹھانے سے ان کے مونڈھے نہ چھلیں۔ لیکن اس کنواری عورتوں سے زیادہ باحیا اور شرمیلی فطرت والے بھتیجے کے لیے اتنی سی برہنگی بھی ناقابل برداشت تھی۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ ابھی لنگی کھلنے نہ پائی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت غیر ہونے لگی اور ایک ایسی اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور فوری طور پر لنگی جوں کی توں باندھ دی۔

ایک اور موقع پر بچے کھیل رہے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اسی کھیل میں بچے پتھر اٹھا اٹھا کر ایک جگہ سے جانے لگے۔ پتھر اٹھانے کے لیے انہوں نے اپنی لنگیاں کھول لیں اور برہنہ ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لنگی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا کہ کسی غیبی شخص نے زور سے ڈانٹ کر کہا "لنگی باندھو" حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے فوراً لنگی باندھ لی اور پتھر اپنی گردن پر اٹھانے لگا"۔[1]

[1] "سیرت ابن ہشام" جلد 1، ص: 183، "البدایہ والنہایہ" جلد 2، ص: 450۔ و سیرت خاتم النبیین۔

11

گلہ بانی

اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ مر الظہر ان میں تھے۔ فاقہ کش صحابہ ایک جنگل میں پہنچ کر پیلو کا پھل توڑ کر کھانے لگے۔ ارشاد فرمایا: سیاہ پھل زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ صحابہ کرام نے تعجب سے عرض کیا: آپ کو کیسے معلوم ہے؟ ارشاد فرمایا: یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ بھی بکریاں چرایا کرتے تھے۔

ارشاد فرمایا: ہاں کوئی ایسا نبی نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔

بچپن میں جب آپ بنوسعد میں اماں حلیمہ سعدیہ کے ہاں مقیم تھے تو اس وقت اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ آپ نے بکریاں چرائیں۔

جب آپ ﷺ ذرا بڑے ہوئے تو آپ نے مکہ مکرمہ میں بکریاں چرائیں۔ چنانچہ بخاری شریف اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ کیا آپ نے بھی؟

ارشاد فرمایا: ہاں میں بھی اہل مکہ کی بکریاں چند قراریط کے عوض چرایا کرتا

تھا۔① سیرت نگاروں نے قراریط کا جو مفہوم لکھا ہے وہ یہ ہے کہ قراریط بکریوں کے دودھ کا وہ حصہ ہے جو اللہ کے رسول ﷺ ان سے اجرت کے طور پر لیا کرتے تھے جسے ابو طالب کے اہل وعیال کے ساتھ بطور غذا استعمال فرمایا کرتے۔

فتح الباری میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: میں بھی اپنے گھر والوں کی بکریاں اجیاد کے مقام پر چرایا کرتا تھا۔

انبیائے کرام کا بکریاں چرانا دنیا کی گلہ بانی کا مقدمہ اور تمہید ہوتی ہے۔ بکریاں چرانے میں گلہ بان کو ہر طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ کچھ بکریاں اس طرف دوڑتی ہیں اور کچھ دوسری طرف ان کو نظم و ضبط میں لانا بہت مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ پھر ان کو بھیڑیوں اور درندوں سے بچانا بھی گلہ بان کے فرائض میں ہوتا ہے۔ انبیاء کو چونکہ امت کا گلہ بان بننا ہوتا ہے۔ اور امت کی صلاح وفلاح کی فکر میں شب و روز سرگرداں رہنا ہوتا ہے۔ امت کے افراد بھیڑ بکریوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں۔ اور انبیاء کرام ان کو ادھر ادھر بھاگنے سے روکتے ہیں۔ ان کو شریعت کے نظم و ضبط میں رکھتے ہیں۔ ان کو شیطان اور نفس کے بھیڑیوں اور اور درندوں سے بچاتے ہیں۔ اس لیے بچپن میں ان سے بکریاں چروا کر ایک ٹریننگ دی جاتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے بچپن اور جوانی میں بھی بکریاں چرائیں۔ آپ نے کتنا عرصہ بکریاں چرائیں۔ کسی روایت میں اس کی تفصیل نہیں ملتی۔

① صحیح بخاری: 2262. وسیرت خاتم النبیین۔

12

حرب فجار کا پس منظر

بعثت نبوی سے کم و بیش بیس سال پہلے کی بات ہے، حیرہ کا بادشاہ نعمان بن منذر اپنے دربار میں بیٹھا ہوا براض بن قیس کنانی سے گفتگو کر رہا تھا۔ عکاظ (طائف) میں ہر سال بہت بڑا میلہ لگتا تھا جس میں نعمان بھی اپنا سامان تجارت بھجوایا کرتا تھا۔ اس نے کہا: براض کیا یہ ممکن ہے کہ میرا سامان بحفاظت حیرہ (عراق کا علاقہ) سے عکاظ تک پہنچ جائے؟ کون شخص ہے جو مجھے راہ داری کی ضمانت دے؟ براض بڑا بڑبولا اور کینہ پرور شخص تھا۔ اس نے کہا: بنو کنانہ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ نعمان کہنے لگا: مجھے صرف کنانہ کی نہیں تمام قبائل کی ذمہ داری لینے والا شخص چاہیے۔

مجلس میں عرب کا ایک اور بڑا سردار عروہ بن عتبہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ عروہ کا تعلق بنو قیس سے تھا جو ہوازن کی ایک شاخ تھے۔ اس نے بادشاہ سے کہا: بادشاہ کی عمر دراز ہو، میں تمام قبائل: بنو قیس، اہل نجد اور تہامہ کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

برّاض نے بڑے غصے اور تعجب سے کہا: عروہ! کیا تم کنانہ کی بھی ذمہ داری لیتے ہو؟ اس نے کہا: صرف کنانہ کی نہیں، میں تو تمام لوگوں کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہوں۔ برّاض کو اس کا انداز پسند نہ آیا۔ کینہ پرور پہلے ہی تھا۔ جب عروہ وہاں سے واپسی کے لیے نکلا تو برّاض بھی تعاقب میں نکل کھڑا ہوا اور دوران سفر عروہ کو غافل پا کر قتل کرنا چاہا۔ عروہ نے معذرت کی کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اللہ کے لیے مجھے قتل نہ کرو۔ مگر برّاض نے اُس کی ایک نہ سنی اور اسے قتل کر ڈالا۔ عروہ کے قتل سے بہت بڑا فتنہ پیدا ہو گیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ قریش کنانہ کی شاخ تھے یہ بنو قیس کے مقابلے پر نکلے۔ قریش کی قیادت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے والد حرب بن امیہ بن عبد شمس کے ہاتھ میں تھی۔ لڑائی کے آغاز میں بنو قیس کا پلڑا بھاری تھا۔ مگر اختتام پر قریش جیت گئے۔ اس جنگ میں چونکہ حرم اور حرمت والے مہینے دونوں کی حرمت پامال کی گئی تھی، اس لیے یہ جنگ حرب فجار (نافرمانوں کی جنگ) کے نام سے موسوم ہوئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں براہ راست شرکت تو نہیں فرمائی، بس اپنے چچاؤں کو تیر پکڑاتے رہے۔ سیرت نگاروں کے مطابق اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک بیس برس کے قریب تھی۔ لڑائی سے فارغ ہوئے تو سب لوگ عبداللہ بن جدعان کے گھر اکٹھے ہوئے اور اس کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اس کے گھر میں ایک ایسا تاریخ ساز معاہدہ ہوا جس کا تذکرہ سب سیرت نگاروں نے کیا ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں دونوں قبائل میں صلح ہو گئی۔ [1]

---

[1] السیرة النبویة لابن ہشام: 1/221-224، والروض الأنف: 1/318-321، والبدایة والنهایة: 2/303،304.

13

حلف الفضول

حرب فجار کو چار مہینے گزر چکے تھے۔ یمن کے ایک شہر "زَبید" کا تاجر سامان تجارت لے کر مکہ آیا۔ مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے اس سے سامان خرید لیا مگر قیمت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس زبیدی نے اچانک بیت اللہ کے سامنے دہائی دی کہ مکہ شریف کے لوگو! عاص نے مجھ سے میری بیٹی بھی چھین لی ہے اور میرے مال کی قیمت دینے سے بھی انکاری ہے۔ اُس نے پہلے تو حلیف قبائل عبدالدار، مخزوم، جمح اور عدی سے مدد کی درخواست کی مگر کسی نے بھی عاص بن وائل کی مخالفت کی حامی نہ بھری بلکہ الٹا زبیدی ہی کو دھمکانے لگے۔ وہ جبل ابو قبیس پر چڑھ گیا اور بلند آواز سے کچھ اشعار پڑھے جن میں اپنی مظلومیت کی داستان بیان کی۔

اللہ کے رسول ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے دوڑ دھوپ کی، لوگوں کو

توجہ دلائی کہ اس کا حق دلایا جائے، پھر عاص بن وائل کو مجبور کیا کہ اس کی بیٹی واپس کرے۔ اس نے کہا: یہ تو میری لونڈی ہے جو میں نے زبیدی سے اس کے مال کے ساتھ خریدی ہے۔ زبیدی بولا: میں بیت اللہ کی عظمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ میری بیٹی ہے جو اس نے اغوا کی ہے۔ شرفاء مکہ نے تحقیق کے بعد اس کا مال اور بیٹی واپس کرائی۔

اس کے بعد عبداللہ بن جدعان کے گھر ایک تاریخی اجتماع ہوا جس میں عہد کیا گیا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا چاہے وہ مقامی باشندہ ہو یا باہر کا آدمی اس کی مدد کی جائے گی۔ اور اس کا حق دلوایا جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی اس میں شریک تھے۔ اس معاہدے کو حلف الفضول کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں فضل نام کے لوگ شریک تھے۔ اس نام کی ایک اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں سب باتیں فضل، یعنی خوبی پر مشتمل تھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ رسالت کے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے: میں عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ لینا بھی پسند نہیں۔ اگر اب بھی مجھے اس قسم کے عہد و پیمان کے لیے بلایا جائے تو میں ضرور لبیک کہوں گا۔[1]

آپ ﷺ کے اس فرمان سے واضح ہے کہ عدل وانصاف کی ہر امیر وغریب کو فراہمی اسلامی معاشرے کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔

---

[1] البدایة والنھایة: 2/306,305، والروض الأنف: 1/242-246 لیکن اس واقعے میں لڑکی کا ذکر خثعم قبیلے کے آدمی اور نبیہ بن حجاج کے درمیان ملتا ہے۔

صادق اور امین ﷺ کا حکیمانہ فیصلہ

نبوت سے پانچ سال پہلے کی بات ہے مکہ مکرمہ میں شدید بارشیں ہوئیں۔ بارش کی کثرت سے سیلاب آ گیا۔ پانی حرم مکی میں داخل ہوا اور خانہ کعبہ کی دیواروں کو بے حد نقصان پہنچا۔ خانہ کعبہ کسی بھی وقت منہدم ہوسکتا تھا چنانچہ قریش کے بڑے سردار جمع ہوئے کہ کعبہ کی از سرنو تعمیر کی جائے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے فیصلے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے زمانے سے اس کی بلندی 9 ہاتھ تھی۔ اس پر چھت نہیں تھی۔ ایک مرتبہ چوروں کو موقع مل گیا۔ انھوں نے اندر رکھا ہوا خزانہ چرا لیا۔ اس وجہ سے بیت اللہ پر چھت ڈالنا ضروری سمجھا گیا۔

متفقہ فیصلہ ہوا کہ اس عظیم گھر کی تعمیر کے لیے صرف حلال رقم استعمال ہوگی۔ رنڈی کی کمائی، سود کا مال اور ناحق کمایا ہوا مال ہرگز استعمال نہ ہوگا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ نئے سرے سے بنیادیں کھودی جائیں، اس لیے پرانی عمارت کا

ڈھانا ضروری تھا۔ مگر کسی میں اس کے آغاز کی جرأت نہ تھی۔ بالآخر ولید بن مغیرہ مخزومی نے ہمت کی اور لمبی دعاؤں کے بعد پھاوڑا چلانا شروع کر دیا۔ لوگ اس اندیشے کا شکار تھے کہ اس پر ابھی کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی مگر کافی انتظار کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ ولید کو کچھ نہیں ہوا تو باقی لوگ بھی انہدام کے اس عمل میں شامل ہو گئے۔ تعمیر کے لیے ہر قبیلے کے ذمہ ایک حصہ لگا دیا گیا۔ ''باقُوم'' نامی ایک رومی معمار نگران تھا۔ قریش کے پاس حلال مال کم پڑ گیا، لہٰذا انھوں نے شمال کی جانب کعبہ کی لمبائی 6 ہاتھ کم کر دی اسی کو حطیم یا حجر کہتے ہیں۔ دروازہ زمین سے خاصا اونچا رکھا تا کہ جسے قریش چاہیں اسے اندر داخل ہونے کی اجازت دیں۔ دیواریں جب پندرہ ہاتھ اونچی ہو گئیں تو اندر چھ ستون کھڑے کر کے چھت ڈال دی گئی۔ مگر چھت ڈالنے سے قبل جب عمارت حجر اسود تک بلند ہوئی تو ایک بڑا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ بنو ہاشم تلواریں لیے آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ حجر اسود کو صرف بنو ہاشم اس کی جگہ پر رکھیں گے۔

ادھر بنو حرب، بنو امیہ اور ان کے چچا زاد بھائی سو کے لگ بھگ افراد جمع ہو گئے۔ کہنے لگے کہ حجر اسود ہم رکھیں گے۔ بنو زہرہ اور بنو سہم میں اتفاق ہو گیا کہ حجر اسود پر ہمارا حق ہے۔ اسے ہم رکھیں گے۔ غرضیکہ سب لڑائی کے لیے تیار ہو گئے، ادھر خالد بن ولید کا چچا امیہ بن مغیرہ کہنے لگا کہ کیوں ایک دوسرے کا خون بہاتے ہو؟ آؤ سب مل کر کسی کو حکم بنا لیتے ہیں، پھر خود ہی تجویز پیش کی کہ تمھارا کیا خیال ہے باب بنی شیبہ میں سے جو سب سے پہلے داخل ہو ہم اُسی کو اپنا حکم بنا لیں

جو وہ فیصلہ کرے اسے سب منظور کر لیں۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ باب بنی شیبہ سے داخل ہوتے نظر آئے۔ آپ ﷺ ابھی خلعتِ نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ سب بیک وقت پکارے: صادق و امین آ گیا۔ یہ محمد ﷺ ہیں، ہم ان کے فیصلہ سے راضی ہیں۔ جب وہ قریب آئے تو ان کو ساری صورت حال بتائی گئی۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک اتاری۔ زمین پر بچھائی۔ حجر اسود کو پکڑا۔ اُسے اُٹھا کر چادر کے درمیان رکھا۔ بنو ہاشم کو بلایا کہ یہ کونہ تم سنبھالو، بنو زہرہ کو دوسری طرف کا کونہ پکڑایا، بنو امیہ تیسری طرف اور بنو تمیم چوتھی طرف کا کونہ سنبھال کر کھڑے ہو گئے، پھر فرمایا: بنو کعب اور دیگر تمام دعویدار سب کے سب چادر پکڑ کر اٹھائیں۔ سب نے نہایت عزت واحترام، محبت اور عقیدت سے چادر کو اٹھایا اور کعبہ کی طرف چل دیے۔ جب حجر اسود کے مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور اسے اس کی جگہ پر ٹکا دیا۔ وہ چہرے جو تھوڑی دیر پہلے غصے سے تمتما رہے تھے، آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور ہاتھوں میں تلواریں چمکنے لگی تھیں اب مسکرا رہے تھے۔ ایک بڑی لڑائی اور عظیم فتنے کا سد باب ہو چکا تھا۔ ایک صادق و امین دانشور اور قائد نے نہایت عمدہ فیصلہ کر دیا۔ ایک ایسی شخصیت کا فیصلہ جس کا دامن کردار پھولوں سے بڑھ کر معطر اور شبنم سے زیادہ پاکیزہ تھا۔ جس نے کبھی چوری نہیں کی جو کبھی بھول کر بھی کسی خیانت کا مرتکب نہیں ہوا۔[1]

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 1/224-234، و تاریخ الطبري: 2/213,212، وصحیح البخاري، حدیث: 1582-1586، وفتح الباري: 3/555-560.

15

غار حراء

غار حراء بیت اللہ شریف سے کم و بیش 5 کلو میٹر دور جبل نور کی چوٹی پر واقع ہے۔ جب حاجی منیٰ کو جاتے ہیں۔ تو منی سے کچھ پہلے یہ پہاڑ ان کے بائیں ہاتھ نظر آتا ہے۔ غار کا رخ قدرتی طور پر کعبے کی سمت ہے۔ اس کا راستہ اتنا دشوار گزار ہے کہ طاقتور اور تنومند نوجوان بھی وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جاتا ہے۔

یہ مختصر سا غار ہے جس کا طول تقریباً 3 میٹر اور عرض ڈیڑھ میٹر کے قریب ہے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کی عمر شریف چالیس برس کے قریب ہوگئی تو آپ وہاں تشریف لے جاتے۔ آپ کے ہمراہ پانی اور ستو ہوتے۔ بعض اوقات حضرت خدیجہ بھی آپ ﷺ کے ہمراہ جاتیں اور قریب ہی کسی جگہ موجود رہتیں۔ آپ رمضان بھر اس غار میں قیام فرماتے۔ آنے جانے والے مسکینوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے۔ اور بقیہ اوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے۔

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر خلوت آپ کو محبوب بنا دی گئی۔ اور آپ غار حراء میں جا کر خلوت گزیں ہوتے۔ آپ اللہ کی یاد اور غور و فکر میں مشغول رہتے۔ سیرت نگاروں نے اسے تحنث کا نام دیا ہے جس کا مفہوم اور

مطلب گوشہ نشینی، تعبد، یعنی عبادت کرنے اور گناہوں سے بچنے کے ہیں۔ بعض نے غور وفکر اور عبرت پذیری کے بھی معانی بیان کیے ہیں۔

آپ نے عبادت کے اس طریقہ کو غور وفکر اور یاد الٰہی کے لیے بہترین ذریعہ سمجھا۔ غار حراء کے اس خلوت کدہ میں آپ اس حقیقت کے متلاشی تھے جو اس سے قبل آپ کو کہیں نہ مل سکی تھی۔ اس حقیقت کے ذرائع میں آپ کی نظر کے سامنے یہ وسیع وعریض عالم تھا۔ اوپر نظر اٹھا کر دیکھتے تو صاف و شفاف نیلگوں آسمان نظر آتا۔ دن کو آفتاب اپنی کرنیں اس کائنات پر لٹاتا۔ رات کو جھلملاتے تارے اور چاند کی چاندنی صحراء پر پھیل جاتی آپ کائنات کے مشاہد اور اس کے پیچھے کارفرما قدرت نادرہ پر غور فرماتے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی قوم کے شرکیہ عقائد اور واہیات تصورات پر بالکل اطمینان نہ تھا۔ آپ کے سامنے کوئی واضح راہ اور معین طریقہ نہ تھا جس پر آپ اطمینان اور انشراح قلب کے ساتھ رواں دواں ہو سکتے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی یہ تنہائی پسندی بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا ایک حصہ تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک آنے والے عظیم الشان کار خیر کے لیے تیار کر رہا تھا۔ آپ کو رویائے صادقہ کے ذریعے بشارات دی جاتیں۔ روایات میں ہے کہ آپ رات کو جو بھی خواب دیکھتے۔ بیدار ہونے کے بعد صبح کی روشنی کی طرح اس کی صاف وشفاف تعبیر ظاہر ہو جاتی۔[1]

---

[1] صحیح بخاری حدیث:4۔ والرحیق المختوم۔

16
مقدر کے سکندر

نبی کریم ﷺ کی دعوت کے ابتدائی ایام ہی میں ضماد ازدی مکہ آیا۔ یہ یمن کا باشندہ تھا اور سارے عرب میں جنتر منتر کے ذریعے علاج کے لیے مشہور تھا۔ جب اس نے سنا کہ محمد ﷺ پر جنات کا اثر ہے تو اس نے قریش سے کہا: میں محمد ﷺ کا علاج منتر سے کر سکتا ہوں۔ یہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: (محمد ﷺ!) آؤ میں تمھارا علاج کر دوں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس کی فضول بات کا جواب دینے کی بجائے ذیل کا خطبہ پڑھنا شروع کیا:

(إنّ الحمدَ لله ، نَحْمدُهُ ونستعينه، من يهده الله فلا مضلَّ له ومن يُضلِلْ فلا هاديَ له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريك له وأشهد أن محمدًا عبدهُ ورسولهُ)

''سب تعریف اللہ کے واسطے ہے، ہم اس کی نعمتوں کا شکرادا کرتے ہیں اور

ہر کام میں اس کی اعانت چاہتے ہیں، اللہ جسے راہ دکھلا دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہی رستہ نہ دکھائے اس کی کوئی رہبری نہیں کر سکتا۔ میری شہادت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ میں یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کا بندہ اور رسول ہے'' (أَمَّا بَعْدُ) ''اس کے بعد مدعا یہ ہے۔''

ضماد نے بس اتنے ہی ارشادات سُنے تھے کہ جھوم اُٹھا اور بولا: یہی کلمات پھر سنا دیجیے۔ دو تین دفعہ اس نے یہی کلمات توجہ سے سنے اور بے اختیار بول اٹھا: میں نے بہت سے کاہن دیکھے، ساحر دیکھے اور شاعروں کو سُنا، لیکن ایسا کلام تو میں نے کسی سے کبھی سنا ہی نہیں۔ یہ کلمات تو ایک اتھاہ سمندر جیسے ہیں۔ اے محمد (ﷺ!) اللہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں اسلام پر آپ ﷺ کی بیعت کرلوں۔ [1]

خالد بن سعید بن عاص بن امیہ اپنے سب بھائیوں سے پہلے مسلمان ہوئے۔ ان کے آغاز اسلام کا قصہ یوں ہے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ نہایت وسیع وعریض آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں اور کوئی اس میں انہیں دھکیل رہا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ اس کی کمر تھامے ہوئے ہیں۔ وہ گھبرا کر نیند سے بیدار ہوئے اور بولے: واللہ! یہ خواب سچا ہے۔ یہ خواب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سنایا۔ انھوں نے کہا: اس میں آپ کی بھلائی ہے۔ یہ حضرت محمد رسول

[1] صحیح مسلم، حدیث: 868.

اللہ ﷺ موجود ہیں، ان کی اتباع کیجیے۔ ان کی اطاعت سے آپ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور اسلام آپ کو آگ میں داخل ہونے سے بچالے گا (جبکہ آپ کا والد اس آگ میں گر رہا ہے)، پھر ان کی رسول اللہ ﷺ سے محلّہ اجیاد میں ملاقات ہوئی۔ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں آپ کو اللہ وحدہ لاشریک کی توحید کی طرف دعوت دیتا ہوں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ بتوں کی پرستش ترک کر دو۔ وہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں، نہ ہی نفع ونقصان کے مالک ہیں، نہ وہ اپنی پوجا کرنے والوں کو پہچانتے ہیں۔'' یہ سن کر خالد رضی اللہ عنہ نے کلمۂ توحید پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ والد کو ان کے اسلام کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ انہیں تلاش کر کے لایا۔ سخت ڈانٹ ڈپٹ کی اور نہایت غصے سے کہا: واللہ! اب ہم تمہیں کھانا نہیں دیں گے۔ خالد نے کہا: آپ نہ دیں گے تو اللہ تعالیٰ مجھے اپنے پاس سے رزق عطا فرمائے گا۔ وہ یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چلے آئے۔[1]

[1] أسد الغابة: 2/124، 125.

17
پہلی ہجرت

نبوت کے پانچویں سال کے وسط کی بات ہے، کافروں کے ظلم وستم میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا۔ جو روستم کا سلسلہ نبوت کے چوتھے سال سے شروع ہوا تھا جو دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ مسلمانوں کے لیے مکہ مکرمہ میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ اور وہ اس اذیت ناک صورتِ حال سے نجات کی تدابیر سوچنے لگے۔ ہمسایہ ملک حبشہ کا بادشاہ اصحمہ ایک عادل حکمران تھا۔ اُس کا لقب نجاشی تھا۔ وہاں رعیت پر کوئی ظلم وستم نہیں ہوتا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ سے اپنے ساتھیوں پر ظلم برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ یہ ظلم وستم صرف فقراء اور مساکین ہی پر نہ تھا بلکہ کھاتے پیتے گھرانے بھی اس کی زد میں تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مشورہ دیا کہ چپکے چپکے مکہ چھوڑ دو اور حبشہ چلے جاؤ تاکہ وہاں امن وسکون سے رہ سکو۔

حبشہ کی سرزمین اہل مکہ کے لیے اجنبی نہ تھی۔ قریش کے لوگ وہاں تجارت کے

لیے جایا کرتے تھے۔ جزیرہ عرب میں حبشہ ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے معروف تھا۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ حبشہ کو ہجرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حبشہ کی سرزمین قریش کے لیے تجارت کا مرکز تھی۔ وہاں امن و امان تھا۔ ایک عادل حکمران تھا۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جب شعب ابی طالب میں مقیم تھے تو مسلمانوں کو حکم دیا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ جبکہ ابن حبان نے لکھا ہے کہ قریش سردیوں کے موسم میں تجارت کے لیے حبشہ جاتے تھے۔

چنانچہ رجب 5 ہجری میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پہلی جماعت نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ اس جماعت میں بارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔ جن میں اللہ کے رسول ﷺ کے داماد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ اس قافلے کے امیر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان بن عفان اپنی بیوی رقیہ رضی اللہ عنہا سمیت ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے اور اللہ کے رسول ﷺ کو خاصے عرصے تک ان کی خیریت و عافیت کی خبر معلوم نہ ہو سکی۔ اچانک ایک دن ایک قریشی عورت نے آپ ﷺ کو بتایا کہ میں نے آپ ﷺ کے داماد کو اہل و عیال سمیت دیکھا ہے آپ ﷺ نے پوچھا: تم نے انہیں کس حالت میں دیکھا؟ اس خاتون نے بتایا: میں نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی کو گدھے پر سوار کیے لیے جا رہے ہیں۔ یہ سُن کر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی کہ اللہ ان کا حامی و ناصر ہو۔ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط رضی اللہ عنہم کے بعد یہ پہلا گھرانہ ہے جس نے

اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔

رات کے اندھیرے میں چپکے سے نکل کر کچھ پیدل اور کچھ سوار افراد کی اس جماعت نے بحر احمر کی بندرگاہ شعیبہ کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے وہاں دو تجارتی کشتیاں موجود تھیں۔ وہ روانہ ہونے ہی والی تھیں۔ نصف دینار فی کس کشتی کا کرایہ طے ہوا اور وہ انہیں اپنے دامن عافیت میں لے کر سمندر پار حبشہ چلی گئیں۔ قریش کو پتا چلا تو انہوں نے ان کا پیچھا کیا مگر جب وہ ساحل سمندر تک پہنچے تو کشتیاں روانہ ہو چکی تھیں، اس لیے انہیں نامراد واپس آنا پڑا۔ یہاں یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلام کے فدائی ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے والا نہیں تھا لیکن حالات اس قدر دُشوار ہو گئے تھے کہ مکہ میں رہ کر فرائض اسلام کا آزادی سے بجالانا ناممکن ہو گیا تھا۔

عالم یہ تھا کہ اس وقت حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو انہوں نے کہا کہ میں یہ فرض ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا، وہ باز نہ آئے۔ حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کی۔ کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کیے، انہوں نے مشرکوں کے طمانچوں کی پروانہ کی۔ جہاں تک قرآن پڑھنا چاہتے تھے، پڑھ کر ہی دم لیا۔ واپس گئے تو اس حال میں تھے کہ چہرے پر زخموں کے نشان لیے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جاہ واقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے لیکن وہ بھی اس قدر مجبور تھے کہ بلند

آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے۔

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی مطلوب تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی چلی جاتی تھیں۔ غرض آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر سب سے پہلے گیارہ مرد حضرات اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔ ان کے نام درجِ ذیل ہیں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ: مع اپنی زوجہ محترمہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ: مع اپنی زوجہ محترمہ جن کا نام سیدہ سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا تھا۔ سیدنا ابو حذیفہ کا والد عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا لیکن چونکہ سخت کافر تھا، اس لیے انہیں گھر چھوڑنا پڑا۔

زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے۔ ہاشم کے پوتے تھے۔

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ: مشہور صحابی جو عشرہ مبشرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ قبیلہ بنو زہرہ سے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ننہیالی رشتہ دار تھے۔

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ (بن عبدالاسد) مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا ۔ یہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا وہی ہیں جو ابو سلمہ کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کے عقد میں آئیں۔

حضرت عثمان بن مظعون جمحی رضی اللہ عنہ: مشہور صحابی ہیں۔

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ مع اپنی زوجہ۔ ان کا نام (حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا بنت ابی حشمہ تھا: سابقون اولون میں ہیں۔ بدر میں شریک تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔

حضرت ابوسبرہ بن ابی رہم: ان کی ماں برہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں یہ سابقون فی الاسلام میں ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے۔

حضرت ابو حاطب بن عمرو رضی اللہ عنہ: بدر میں شریک تھے۔ امام زہری کا بیان ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے۔

حضرت سہیل بن بیضاء: قریشی تھے اور بنو فہر سے تعلق تھا۔ یہ حبشہ کی پہلی اور دوسری ہجرت دونوں میں شامل تھے۔ سن ۹ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔ سابقون اولون میں سے ہیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کے اس سفر میں ان کا بیٹا سائب بھی شامل تھا۔ مہاجرین میں مدینہ میں وفات پانے والے یہ سب سے پہلے شخص ہیں۔ دو ہجری میں فوت ہوئے۔

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا۔ اس قافلہ

کے متعدد شرکاء، مثلاً: زبیر اور مصعب خود آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوسبرہ معمولی لوگ نہ تھے اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم صرف بے کسوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے باا ثر خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر لٹایا جاتا تھا، یعنی حضرت بلال، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ ان حضرات کا نام مہاجرینِ حبشہ کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ یا تو ان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا یا یہ فدایانِ حق لذتِ درد میں ایسے گُم تھے کہ اُنھیں لُطفِ ستم چھوڑنا بھی گوارا نہیں تھا۔

پہلی ہجرت حبشہ کو کم و بیش تین ماہ گزر چکے تھے کہ مکہ مکرمہ کے حالات میں خاصی تبدیلی واقع ہوگئی۔ اللہ کے رسول ﷺ کے چچا اور رضاعی بھائی حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو خاصی تقویت ملی اور پھر چند دنوں بعد ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ ان دونوں کا اسلام لانا مسلمانوں کے لیے عزت اور وقار کا سبب بنا۔ پہلے مسلمان دارارقم میں چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ مگر اب پہلی بار سرِ عام کعبہ کے نزدیک نماز ادا کی جانے لگی۔ مشرکین کے ظلم و ستم جاری تھے مگر وقتی طور پر ان میں کمی آ گئی۔ اب مزاحمت کرنے والے بھی آ گئے تھے۔ اسی دوران رمضان شریف میں یہ واقعہ پیش آیا: نبی کریم ﷺ ایک بار حرم تشریف لے گئے۔ وہاں قریش کا

بہت بڑا مجمع تھا۔ ان کے سردار اور بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ آپ نے اچانک کھڑے ہو کر سورۂ نجم کی تلاوت شروع کر دی۔ ان کفار نے اس سے پہلے عموماً قرآن سنا نہ تھا کیونکہ ان کا دائمی وتیرہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھا:

﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ (فصلت: 26)

''اس قرآن کو مت سنو اور اس میں خلل ڈالو (اودھم مچاؤ) تاکہ تم غالب رہو۔''

لیکن جب نبی ﷺ نے اچانک سورۂ نجم کی تلاوت کی اور ان کے کانوں میں ایک ناقابل بیان رعنائی و دلکشی اور عظمت والے کلام الٰہی کی آواز پڑی تو انہیں کچھ ہوش نہ رہا۔ سب کے سب بے اختیار گوش برآواز ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب آپ ﷺ نے سورہ کے آخر میں دل ہلا دینے والی آیات تلاوت فرما کر اللہ کا درج ذیل حکم سنایا اور سجدہ کیا تو سب کے سب بے قابو ہو کر سجدے میں گر گئے:

﴿ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴾

''اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔''[1]

اس واقعے کی اطلاع جب مکہ کے دوسرے مشرکین کو ہوئی تو انہوں نے ان پر ہر طرف سے عتاب اور ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اب ان لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے رسول اللہ ﷺ پر یہ جھوٹ گھڑا کہ آپ ﷺ نے تو ان کے بتوں کا ذکر عزت و احترام سے کرتے

---

[1] صحیح البخاري: 1070,1067، و صحیح مسلم: 576، سنن أبي داود: 1406.

ہوئے یہ کہا تھا:

(تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وإن شفاعَتَهُنَّ لَتُرْجٰى)

''یہ بلند پایہ دیویاں ہیں۔ اوران کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔''

حالانکہ یہ صریح جھوٹ تھا اور محض اس لیے گھڑ لیا گیا تھا تاکہ نبی ﷺ کے ساتھ ہی سجدے میں گر جانے کی جو ''غلطی'' ہوگئی ہے اس کے لیے ایک ''معقول'' عذر پیش کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ نبی پر ہمیشہ جھوٹ گھڑتے اور آپ ﷺ کے خلاف ہمیشہ دسیسہ کاری اور افترا پردازی کرتے رہتے تھے، وہ اپنا دامن بچانے کے لیے اس طرح کا جھوٹ کیوں نہ گھڑتے۔

بہرحال مشرکین کے سجدہ کرنے کے اس واقعے کی خبر حبشہ کے مہاجرین تک بھی پہنچی لیکن انہیں اس کا اصل پس منظر معلوم نہ ہو سکا۔ وہ یہ سمجھے کہ قریش مسلمان ہو گئے ہیں، چنانچہ انہوں نے ماہ شوال میں مکہ واپسی کی راہ لی لیکن جب اتنے قریب آ گئے کہ مکہ ایک دن سے بھی کم فاصلے پر رہ گیا تو اصل حقیقت حال آشکارا ہوئی۔ اس کے بعد کچھ لوگ تو وہیں سے حبشہ پلٹ گئے اور کچھ لوگ چھپ چھپا کر یا قریش کے کسی آدمی کی پناہ لے کر مکے میں داخل ہوئے۔

مسلمانوں میں سے جو حبشہ سے واپس ہوئے ان پر خصوصاً اور دیگر مسلمانوں پر عموماً قریش کا ظلم و ستم پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ ان کے خاندان والوں نے انہیں بہت تنگ کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ قریش کو حبشہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کی جو خبر ملی تھی وہ اس پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ جب یہ مظالم حد سے بڑھ گئے تو اللہ کے

رسول ﷺ نے مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک بڑا قافلہ جس میں بیاسی مرد اور اٹھارہ عورتیں شامل تھیں حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ اسے دوسری ہجرت حبشہ کہا جاتا ہے۔

یہ دوسری ہجرت پہلی ہجرت کے مقابلے میں بہت زیادہ مشکلات سے اٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ اب کی بار قریش پہلے سے چوکنے تھے اور ایسی ہر کوشش ناکام بنانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔ لیکن مسلمان ان سے کہیں زیادہ مستعد ثابت ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے سفر آسان بنا دیا، چنانچہ وہ قریش کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شاہ حبشہ کے پاس پہنچ گئے۔ [1]

---

[1] زاد المعاد: 1/24، و مختصر السیرۃ للشیخ عبد اللہ: 125.

18

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے!

نجاشی کی بدولت مسلمان حبشہ میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن قریش مسلمانوں کے آرام و راحت کی خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو۔ اس سفارت کی کامیابی کے لیے زبردست تیاریاں کی گئیں۔ نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے بہت قیمتی تحائف مہیا کیے گئے اور پورے سروسامان سے یہ سفارت حبشہ کو روانہ ہوئی۔ سیرت نگاروں نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ مکہ کا سب سے بہترین تحفہ چمڑا تھا جو نجاشی کو بڑا پسند تھا۔ کفار مکہ نے بڑی مقدار میں چمڑا اکٹھا کیا۔ سفارت کے لیے عرب کے ذہین ترین فرزند عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کو چنا گیا۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے۔ ان کی خدمت میں تحائف پیش کیے اور کہا کہ ہمارے شہر میں

چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ ہم نے انہیں نکال دیا تو وہ آپ کے ملک میں بھاگ آئے۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے بارے میں درخواست پیش کریں گے آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے۔ نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کر دیے جائیں۔ درباریوں نے تائید کی۔

لیکن نجاشی نے سوچا کہ اس قضیے کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سننا اور جاننا ضروری ہے، چنانچہ اس نے مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ مسلمان یہ تہیہ کر کے اس کے دربار میں آئے کہ ہم سچ ہی بولیں گے۔ نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے۔ جب مسلمان آ گئے تو نجاشی نے پوچھا: یہ کون سا دین ہے جس کی بنیاد پر تم نے اپنی قوم سے بھی علیحدگی اختیار کر لی ہے اور میرے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے؟ مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) کو مقرر کیا۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے سوالوں کے جواب میں جو تقریر فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے:

اے بادشاہ! ہم ایسی قوم تھے جو جاہلیت میں مبتلا تھی۔ ہم بُت پوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے۔ قرابت داروں سے تعلق توڑتے تھے۔ ہمسایوں سے بدسلوکی کرتے تھے۔ ہمارا ہر طاقتور آدمی کمزور کو کھا رہا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے کرم فرمایا۔ ہم ہی میں سے ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا۔ اس

کی عالی نسبی، سچائی، امانت اور پاک دامنی ہمیں پہلے ہی سے خوب معلوم تھی۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سمجھایا کہ ہم صرف ایک اللہ کو مانیں۔ اسی کی عبادت کریں۔ اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے تھے انہیں چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، قرابت جوڑنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے اور حرام کاری وخونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ فواحش میں ملوث ہونے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورت پر جھوٹی تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اس نے ہمیں نماز، روزہ اور زکاۃ کا حکم دیا......۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اسی طرح روشنی ڈالتے ہوئے کہا: ہم نے اس پیغمبر کو سچا مانا، اس پر ایمان لائے۔ اور اس کے لائے ہوئے دین کی پیروی کی۔ ہم نے ایک اللہ کی عبادت کی۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔ اس پیغمبر نے جن باتوں کو حرام بتایا انہیں حرام مانا۔ جن کو حلال بتایا انہیں حلال جانا۔ اس پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی۔ اس نے ہم پر ظلم وستم کیا۔ ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے فتنے کھڑے کر دیے، ہمیں سخت سزاؤں سے دوچار کیا تاکہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر بُت پرستی کی طرف پلٹ جائیں اور جن گندی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے، انہیں پھر سے حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر شدید مظالم ڈھائے، ہم پر زمین تنگ کر دی۔ جب وہ ہم لوگوں اور ہمارے

دین کے درمیان روک بن کر کھڑے ہوگئے تو ہم نے ہجرت کی اور آپ کے ملک کی راہ لی۔ دوسروں پر آپ کو ترجیح دی۔ آپ کی پناہ میں رہنا پسند کیا۔ ہمیں پوری اُمید تھی کہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

نجاشی نے پوچھا: وہ پیغمبر جو کچھ لائے ہیں کیا وہ تمہارے پاس ہے؟

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں!

نجاشی نے کہا: ذرا مجھے بھی سناؤ۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے پرسوز آواز میں سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں۔ نجاشی اللہ کا مقدس کلام سُن کر اس قدر رویا کہ اس کی داڑھی تر ہوگئی۔ نجاشی کے درباری بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ ان کے صحیفے تر ہوگئے۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور وہ کلام جو عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے دونوں ایک ہی شمع دان کی کرنیں ہیں۔ اس کے بعد نجاشی نے عَمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو مخاطب کر کے حکم دیا کہ تم دونوں چلے جاؤ۔ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کرسکتا۔ نہ یہاں ان کے خلاف کوئی چال چلی جاسکتی ہے۔

اس کے حکم پر وہ دونوں وہاں سے نکل گئے۔ لیکن پھر عَمرو بن عاص نے عبداللہ بن ربیعہ سے کہا: اللہ کی قسم! کل ان کے بارے میں ایسی بات لاؤں گا کہ ان کی ہریالی کی جڑ کاٹ کر رکھ دوں گا۔ عبداللہ بن ربیعہ نے کہا: نہیں ایسا نہ کرنا۔ ان لوگوں نے اگرچہ ہمارے دین سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن ہیں تو بہر حال اپنے ہی

لوگ ۔مگر عمر و بن عاص نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی رائے پر اصرار کیا۔

اگلا دن آیا تو عمر و بن عاص نے نجاشی سے کہا: اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں ایک بُری بات کہتے ہیں۔اس پر نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمان کیا کہتے ہیں۔اس دفعہ مسلمانوں کو گھبراہٹ ہوئی۔لیکن انہوں نے طے کیا کہ ہم بہرحال سچ ہی بولیں گے، چنانچہ جب مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔اور اس نے ان کے سامنے اپنا سوال رکھا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری پاک دامن حضرت مریم علیہا السلام کی طرف القا کیا تھا۔

اس پر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور بولا: اللہ کی قسم! جو کچھ تم نے کہا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے اس تنکے کے برابر بھی بڑھ کر نہ تھے۔اس پر نجاشی کے درباری علماء نے ''ہونہہ'' کی آواز لگائی۔نجاشی نے کہا: ہاں! چاہے تم لوگ ''ہونہہ'' ہی کہو۔

اسکے بعد نجاشی نے مسلمانوں سے کہا: جاؤ! تم لوگ میری مملکت میں محفوظ و مامون ہو۔جو تمہیں گالی دے گا اس پر تاوان عائد کیا جائے گا۔مجھے گوارا نہیں کہ تم میں سے کسی آدمی کو ستاؤں۔تمہیں ستانے کے بدلے سونے کا پہاڑ بھی دیا جائے تو

مجھے قبول نہیں۔

اس کے بعد نجاشی نے اپنے حاشیہ نشینوں کو حکم دیا: ان دونوں کو ان کے ہدیے واپس کر دو۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ [1] ...... یوں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سُرخرو فرمایا۔ اور کفار مکہ کے سفیر خائب و خاسر ہو کر واپس چلے آئے۔

[1] مسند أحمد بن حنبل: 202/1، و مستدرک الحاکم: 310/2، و السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 370/1.

19

ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ قبیلہ غفار کے ایک فرد تھے۔ انھیں خبر پہنچی کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس آسمان سے خبریں آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے بھائی سے کہا: ''اس شخص کے پاس جاؤ، اس سے گفتگو کرو اور پھر مجھے اس کی خبر دو۔'' وہ روانہ ہوئے۔ مکہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، پھر اپنے بھائی ابو ذر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آ گئے۔ ابو ذر نے پوچھا: ''کیا خبر لائے؟'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ وہ خیر اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے۔ برائی سے روکتا ہے۔ اس کا کلام حقیقت پر مبنی ہے۔ شعر و شاعری نہیں ہے۔'' حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے اپنی خبر سے میری تشفی نہیں کی۔ انھوں نے دامن جھاڑا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنا تھیلا، پانی کا مشکیزہ، توشہ اور عصا سنبھالا اور مکہ آن پہنچے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے نہیں تھے۔ اور کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ زمزم کا پانی پیتے

رہے اور مسجد ہی میں ٹھہر گئے۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ رات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ شخص مسافر معلوم ہوتا ہے، دریافت کیا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی: ''ہاں، میں مسافر ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: تو آؤ گھر چلو۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل دیے۔ دونوں چپ چاپ رواں دواں تھے۔ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کچھ پوچھا نہ انھوں نے انہوں نے کچھ بتلایا۔ صبح ہوئی تو وہ پھر مسجد آ گئے تاکہ کسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتا پتا معلوم کریں لیکن کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ بتاتا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر وہاں سے گزرے اور انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ صبح ہوئی تو وہ پھر مسجد آ گئے اور مسجد ہی میں قیام فرما رہے یہاں تک کہ رات ہوگئی، حسب معمول حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر ان کے پاس سے گزرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تمھیں ابھی تک اپنی منزل معلوم نہیں ہوئی؟ انھوں نے کہا: ''ابھی معلوم نہیں ہوسکی'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے ساتھ چلو۔'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تم اس شہر میں کس غرض سے آئے ہو؟'' وہ بولے: ''اگر تم ظاہر نہ کرو تو بتاؤں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمھاری بات کسی پر ظاہر نہ کروں گا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ یہاں ایک شخص ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ پہلے میں نے اپنے بھائی کو بھیجا تھا کہ اس سے گفتگو کرے۔ وہ واپس آیا لیکن اس کی خبر سے مجھے تسلی نہیں ہوئی، لہٰذا اب میں خود ہی اس شخص سے ملنے آیا ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: ''تم صحیح شخص کے پاس پہنچ گئے ہو۔ میں اس وقت وہیں جا رہا ہوں، تم بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ جہاں میں جاؤں تم بھی وہیں داخل ہو جانا۔ اگر مجھے کسی شخص سے کسی قسم کا اندیشہ ہو گا تو میں دیوار کے قریب رک جاؤں گا اور ظاہر یہ کروں گا کہ میں اپنی جوتی ٹھیک کر رہا ہوں مگر تم برابر چلتے رہنا۔'' حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل پڑے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینِ حنیف کی وضاحت فرمائی تو انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ شفقت فرمایا: ''ابوذر! ابھی اس بات کو خفیہ رکھو۔ اپنے شہر لوٹ جاؤ۔ جب ہمارے غلبہ کی خبر ملے تو ہمارے پاس آ جانا۔'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! میں ان لوگوں کے سامنے اعلانِ حق کروں گا۔'' پھر وہ مسجد گئے، وہاں قریش موجود تھے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے قریش کی جماعت! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود و حاکم نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔'' کفار میں غصے اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے کہا: اس بے دین کی خبر لو۔ لوگ کھڑے ہوئے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو مارنے لگے۔ اتنا مارا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئے۔ اتنے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ آ پہنچے۔ وہ ابوذر رضی اللہ عنہ پر جھک گئے، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ''نادانو! تمھاری خرابی ہو، تم غفار کے آدمی کو قتل کر رہے ہو؟

ان کا شہر تمہاری تجارتی منڈی کے گزر گاہ ہے۔ اسے مار کر وہاں سے کیسے گزر و گے؟ یہ سن کر لوگ ان کے پاس سے ہٹ گئے۔ دوسرے دن صبح طلوع ہوئی تو انھوں نے حمایت حق میں پھر وہی کلمے دہرائے، لوگوں نے پھر کہا: اس کی خبر لو، انھوں نے پھر اسی طرح اُن کی پٹائی کی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پھر آئے۔ ان پر جھک گئے اور وہی بات جتلائی جو پہلے دن کہی تھی۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ واپس چلے آئے اور اپنی قوم سے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔[1]

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ابو ذر رضی اللہ عنہ اپنی والدہ اور بھائی انیس کے ساتھ پھر مکہ روانہ ہوئے۔ مکہ کے سامنے پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ انیس نے کہا: مجھے مکہ میں کچھ کام ہے میں مکہ جاتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو، ابو ذر رضی اللہ عنہ وہیں ٹھہر گئے۔ انیس گئے۔ خاصی دیر کے بعد آئے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اتنی دیر کیوں لگائی؟ وہ کہنے لگے: ''میں مکہ میں ایک شخص سے ملا۔ وہ تمھارے دین پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اسے بھیجا ہے۔'' ابو ذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''لوگ اسے کیا کہتے ہیں؟'' انیس نے کہا: ''لوگ اسے شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں۔'' انیس خود بھی شاعر تھے۔ کہنے لگے: میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سن رکھی ہیں لیکن جو کلام یہ شخص پڑھتا ہے وہ کاہنوں کا کلام نہیں۔ میں نے اس کے کلام کا موازنہ شاعروں کے کلام سے بھی کیا لیکن کسی شخص کی زبان پر ایسے مؤثر اور موزوں شعر نہیں آ سکتے۔ اللہ کی قسم! وہ سچا ہے اور اس کے مخالف لوگ جھوٹے ہیں۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اب تم یہیں رہو، میں اسے جا کر دیکھتا ہوں،۔ وہ مکہ

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3861,3522.

آئے۔ ایک ناتواں شخص کو منتخب کیا۔ اس سے پوچھا: ''وہ شخص کہاں ہے جسے تم صابی کہتے ہو؟'' اس فتنہ پرور ناتواں شخص نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی بات سنتے ہی شور مچا دیا اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ صابی آ گیا ہے۔ یہ سن کر سارے وادی والے ڈھیلے اور ہڈیاں لے کر ان پر پل پڑے۔ اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو پھر کھڑے ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خون آلود ہونے کی وجہ سے وہ ایک لال بت معلوم ہو رہے ہیں۔ فوراً زمزم کے پاس گئے۔ خون دھویا۔ پانی پیا، پھر تیس دن وہاں ٹھہرے، زمزم کے علاوہ ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لیکن محض زمزم کا پانی پی پی کر ہی وہ موٹے تازے اور شگفتہ و شاداب ہو گئے اور فاقوں کے باوجود ناتوانی کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ چاندنی رات تھی۔ مکہ والے سو رہے تھے۔ اس وقت بیت اللہ خالی تھا۔ کوئی شخص طواف نہیں کر رہا تھا۔ صرف دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ اساف اور نائلہ نامی بتوں کو پکار رہی تھیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اساف کا نکاح نائلہ سے کر دو۔ وہ پھر بھی باز نہیں آئیں، بتوں کو پکارتی رہیں۔ جب وہ دوبارہ ان کے پاس سے گزریں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پھر ان بتوں کو برا بھلا کہا۔ دونوں عورتیں بہت چلائیں اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئیں۔ وہ کہہ رہی تھیں: کاش! اس وقت کوئی ہمارا آدمی ہوتا۔ راستے میں ان عورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے۔ وہ پہاڑ سے اتر رہے تھے۔ انھوں نے ان عورتوں سے پوچھا: کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا: اُدھر ایک صابی آیا ہوا ہے۔ کعبہ کے پردوں میں چھپا بیٹھا ہے۔ انھوں نے پوچھا: ''وہ کیا کہتا ہے؟'' عورتوں

نے کہا: وہ فحش بات کہتا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ (مسجد میں) تشریف لائے۔ حجر اسود کو بوسہ دیا۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے طواف کیا اور نماز پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا:

(اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ)

آپ ﷺ نے فرمایا: (وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ).

آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم کون ہو؟''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غفار کا ایک شخص ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ اٹھایا اور اپنی مبارک انگلیاں اپنی پیشانی پر رکھیں۔

ابوذر رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ غفار کہنا آپ ﷺ کو ناگوار گزرا ہے۔ وہ آپ ﷺ کا ہاتھ تھامنے کے لیے آگے بڑھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا حال حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ جانتے تھے، اس لیے انھوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو روکا۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے سر اٹھایا اور پوچھا: ''تم کب یہاں آئے؟''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: تیس دن ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تمھیں کھانا کون کھلاتا ہے؟''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: زمزم کے پانی کے علاوہ مجھے کھانے پینے کو اور کچھ نہیں ملا۔ میں اسی سے موٹا ہو گیا ہوں۔ بھوک یا ناتوانی بھی معلوم نہیں ہوتی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زمزم کا پانی برکت والا ہے۔ یہ کھانے کی طرح پیٹ بھر دیتا ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ''آج مجھے انھیں کھانا کھلانے کی اجازت دیجیے۔'' پھر وہ چلے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو اطمینان سے بٹھایا۔ پھر انھیں طائف کی کشمش نکال نکال کر کھلانے لگے۔ یہ پہلا کھانا تھا جو انھوں نے مکہ میں کھایا، وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ایک کھجور والی زمین دکھائی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ یثرب کے علاوہ کوئی اور جگہ نہیں ہے، لہٰذا تم ابھی چلے جاؤ اور اپنی قوم میں تبلیغ کرو، ممکن ہے اللہ تمھارے ذریعے سے انھیں نفع پہنچائے اور تمھیں ثواب عطا فرمائے۔'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ انیس کے پاس آئے۔ انیس نے پوچھا: تم نے کیا کیا؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں مسلمان ہو گیا ہوں اور ان کی نبوت کی تصدیق کرتا ہوں۔'' انیس نے کہا: ''تمھارے دین سے مجھے بھی نفرت نہیں ہے۔ میں بھی اسلام قبول کرتا ہوں۔'' پھر وہ دونوں اپنی والدہ کے پاس گئے۔ انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اب انھوں نے اونٹوں پر اپنا سامان لادا اور اپنی قوم غفار میں پہنچے۔ ان کی تبلیغ ودعوت سے آدھی قوم مسلمان ہو گئی۔ باقی آدھی قوم نے کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ ان لوگوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ جونہی رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچے تو باقی قوم بھی مسلمان ہو گئی۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2473، 2474.

20

انہی دنوں ابوجہل نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صفا پہاڑی کے پاس آڑے ہاتھوں لیا، اذیت پہنچائی، سب وشتم کیا اور اسلام کے بارے میں نہایت ناگوار باتیں کہیں۔ یہ سارا ماجرا کسی نے عم رسول اکرم حمزہ بن عبدالمطلب کو جا سُنایا۔ جناب حمزہ کو بڑا طیش آیا۔ وہ فوراً ابوجہل کی طرف گئے، اس کے پاس پہنچ کر اس کے سر پر اتنے زور سے کمان ماری کہ وہ شدید زخمی ہو گیا۔ چند مخزومی ابوجہل کی مدد کے لیے آئے اور سیدنا حمزہ سے کہنے لگے: جناب حمزہ! معلوم ہوتا ہے کہ آپ صابی اور بے دین ہو چکے ہیں۔ حمزہ نے کہا: مجھے مسلمان ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ اب ایسے حقائق واضح ہو چکے ہیں جن کی روشنی میں (علانیہ) شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کا فرمان حق ہے۔ واللہ! میں اس سے ہرگز پیچھے نہ ہٹوں گا۔ اگر تم میں ہمت ہو تو مجھے روک کر دکھاؤ۔ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: چلو چھوڑو، میں نے بھی اس کے برادر زادے کو نہایت بری

طرح سب وشتم کیا ہے۔ جب حمزہ مسلمان ہو گئے تو قریش سمجھ گئے کہ رسول اللہ ﷺ مضبوط اور محفوظ ہو گئے ہیں۔ بقول ابن اسحاق، پھر حمزہ رضی اللہ عنہ گھر واپس آئے تو شیطان نے وسوسے ڈالنے شروع کر دیے، آپ قریش کے رئیس ہیں، آبائی دین چھوڑ کر (معاذ اللہ) اس بے دین کے پیچھے لگ گئے، اس سے تو موت بہتر ہے، چنانچہ حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دل میں کہا: میں کیا کر چکا ہوں۔ الٰہی! اگر یہ دین اچھا ہے تو میرے دل میں اس کی سچائی کا یقین پیدا فرما ورنہ مجھے اس حیرت سے نجات کا ذریعہ بتا، رات بھر اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یا ابن اخی! اے بھتیجے! میں ایک مخمصے اور الجھن میں پھنس گیا ہوں، اس سے خلاصی نہیں پا رہا، مجھ جیسے دانشور کا ششدر ہونا اور پریشان رہنا کہ آیا اسلام رشد و ہدایت ہے یا گمراہی ہے، نہایت اذیت ناک بات ہے۔ مجھے اپنی دعوت وضاحت سے سمجھائیے، میں آپ کی بات سمجھنے کا بہت مشتاق ہوں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں وعظ و نصیحت فرمائی، دوزخ سے خوف دلایا اور جنت کی خوشخبری سنائی۔ رسول اللہ ﷺ کے وعظ و نصیحت کے باعث اللہ تعالیٰ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے دل میں ایمان کی شمع روشن کر دی تو انھوں نے کہا: میں تہ دل سے گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور میں آپ کے دین کی علانیہ اور کھل کر تبلیغ کروں گا۔ مجھے ساری کائنات بھی دے دی جائے، تب بھی مجھے اپنا پہلا دین پسند نہیں، چنانچہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان افراد میں ہوا جن کی بدولت اللہ تعالیٰ نے دین کو مضبوط و مستحکم فرمایا۔[1]

[1] البدایۃ والنہایۃ: 39/3، ودلائل النبوۃ للبیہقی: 214,213/2.

21

......اور ابو جہل بھاگ نکلا

سیرت کا قاری چشم تصور سے پندرہ صدیاں پہلے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف کو دیکھ رہا ہے جہاں قریش مکہ کی ایک ٹولی ابو جہل کے ارد گرد بیٹھی ہوئی ہے۔ سامنے ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ مقدس گھر ہے۔ اسلام بتدریج پھیلتا جا رہا ہے۔ کافروں کی ساری کوششیں اور توانائیاں اس دعوت حق کو روکنے میں لگی ہوئی ہیں مگر حق کی آواز مسلسل گونج رہی ہے اور بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ ابو جہل جو امت مسلمہ کا فرعون ہے، اس کا سب سے من بھاتا موضوع یہ ہے کہ مسلمانوں کو تکلیف و اذیت کیسے پہنچائی جائے۔ اچانک اس نے پہلو بدلا، اس کے چہرے سے حسد، حقد اور عناد صاف ظاہر تھا اس نے راز داری سے کہا: اے قریش! آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دین کی عیب چینی، ہمارے آباء و اجداد کی بدگوئی، ہماری عقلوں کی تنقیص اور ہمارے معبودوں کی تذلیل سے باز نہیں

آ رہا، اس لیے میں اللہ سے یہ عہد کر رہا ہوں کہ میں ایک بہت بھاری اور مشکل سے اٹھایا جانے والا پتھر لاؤں گا اور جب یہ سجدہ کرے گا تو اس بھاری پتھر سے اس کا سر کچل کر رکھ دوں گا۔ اب اس کے بعد تمھاری مرضی ہے کہ تم میری تایید کرو یا نہ کرو، مجھے بے یار و مددگار چھوڑ دو یا میری حمایت میں اٹھ کھڑے ہو۔ بنو عبد مناف میرے ساتھ جو جی چاہے کریں اس کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے یہ کام ہر حال میں کرنا ہے۔ حد ہو گئی ہے۔ اب اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے مکروہ اور فاسد عزائم ان کے دلوں کے بھی ترجمان تھے۔ انھوں نے تایید میں اپنے سر ہلائے اور کہا: ابوالحکم! بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم تمھیں بنو عبد مناف کے سپرد کریں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو، ہم تمھارے ساتھ ہیں۔

اگلے روز صبح سویرے ابوجہل نے ایک بہت بڑا پتھر اٹھا لیا اور بیت اللہ میں محمد ﷺ کا انتظار کرنے لگا۔ پتھروں کے پجاری صحن حرم میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ بے چینی سے منتظر تھے کہ ابھی ایک بڑا اقدام ہونے والا ہے۔ ابوجہل اپنی بات کا بڑا پکا ہے وہ ضرور اپنے منصوبے پر عمل کرے گا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ وہ روزانہ بیت اللہ تشریف لاتے، بیت المقدس کی طرف منہ کرتے اور نماز پڑھتے تھے۔ درمیان میں ان کے جدِ امجد ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا بنایا ہوا کعبہ ہوتا جس کی تولیت صدیوں سے ان کے خاندان کے سپرد تھی۔ آج بھی آپ ﷺ حسبِ معمول تشریف لائے۔ چہرے کا رخ بیت المقدس کی طرف کر لیا، نماز کے لیے کھڑے ہوئے، قیام کیا، پھر رکوع میں چلے گئے۔ اب

اپنے رب کے حضور سجدہ کر رہے ہیں جو ہر مشکل اور پریشانی میں ان کا حامی و ناصر ہے۔ ادھر وہ سجدے میں جاتے ہیں، ادھر ابوجہل اپنے ناپاک ارادے پر عمل کے لیے اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ بھاری پتھر اس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔ بہت سی نگاہیں ابوجہل کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اب وہ آگے بڑھا اللہ کے رسول ﷺ کے قریب ہوا۔ پتھر مارنے کے لیے اپنے ہاتھ بلند کیے...... ارے! یہ کیا؟ ...... پتھر اس کے ناپاک ہاتھوں سے گر پڑا۔ اب وہ تھر تھر کانپنے لگا، چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ شکست خوردہ حالت میں پیچھے ہٹا اور بھاگ نکلا۔ قبیلے کے وہ لوگ جو تماشا دیکھنے کے لیے وقت سے پہلے ہی جمع ہو گئے تھے، نہایت تعجب سے ابوجہل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ان میں سے ایک شخص نے بے ساختہ پوچھا: ''مَا لَکَ یَا أَبَا الْحَکَمِ'' ارے ابوالحکم! تمھیں کیا ہو گیا......؟ اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور جسم بے چارگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے زبان نے اس کا ساتھ دیا۔ اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا: کل جس منصوبے کا میں نے اعلان کیا تھا اس پر عمل درآمد کے لیے میں محمد (ﷺ) کی طرف بڑھا، جب میں ان کے قریب ہوا تو میں نے اپنے اور ان کے درمیان آگ کے شعلے اگلتی خندق دیکھی، بہت سی خوفناک چیزیں اور پر مجھے نظر آئے۔ میں خوفزدہ ہو کر پیچھے کو بھاگا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: وہ اللہ کے فرشتے تھے۔ اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کی بوٹی بوٹی نوچ لیتے۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2797، ودلائل النبوۃ للبیہقی: 189/2.

عمر بن خطاب فاروق اعظم کس طرح بنے؟

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسلام لائے دو دن گزرے تھے۔ یہ بدھ کا دن، نبوت کا چھٹا سال اور ذوالحجہ کا مہینہ تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الٰہی میں اپنے مبارک ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا: ''اے اللہ! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے جو شخص تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اس کے ذریعے سے اسلام کو قوت عطا فرما۔''...... اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پسند فرمایا اور اگلے دن، یعنی جمعرات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ سیرت نگاروں نے ان کے اسلام لانے کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ اور مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصی زندگی کے حوالے سے چند باتیں بتا دی جائیں۔ ان کا تعلق بنو عدی سے تھا۔ وہ آل اسماعیل میں سے ہیں اور ان کا نسب اوپر جا

کر اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مل جاتا ہے۔ یہ بڑے تنومند تھے اور لمبے قد کے مالک تھے۔ جسم نہایت طاقتور تھا۔ اپنی تند مزاجی اور سخت خوئی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ طویل عرصے تک مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں طرح طرح کی سختیاں جھیلی تھیں۔ ان کے خاندان کی ایک لونڈی مسلمان ہوگئی۔ اسے اس قدر مارتے تھے کہ مارتے مارتے خود تھک جاتے تھے۔ اس کے بعد کہتے تھے: میں نے تجھے کسی مروت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض تھک جانے کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ ایک طرف اپنے آباء واجداد کی ایجاد کردہ رسموں کا بڑا احترام کرتے تھے اور دوسری طرف ایمان اور عقیدے کی راہ میں مسلمانوں کی پختگی اور مصائب جھیلنے کے سلسلے میں ان کی قوت برداشت کو خوشگوار حیرت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ مدت تک اسلام اور اس کی واضح تعلیمات کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کے دل میں سب سے پہلے اسلام کا بیج کب بویا گیا؟ اس بارے میں وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہیں رات گھر سے باہر بسر کرنا پڑی۔ وہ حرم پہنچے اور خانہ کعبہ کے پردوں میں گھس گئے۔ اس وقت اللہ کے رسول ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ زبانِ مبارک پر سورۂ حاقہ کی آیات کی تلاوت جاری تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کان اس خوبصورت آواز اور حکمت بھرے کلام پر لگا دیے۔ واہ! کیا خوبصورت کلام ہے، اس کا ربط کتنا شاندار ہے اور اس کے الفاظ کتنے پاکیزہ اور روح پرور ہیں۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ مگر دل ہی دل میں کہنے لگے: یہ تو واقعی شاعر ہے۔ قریش ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ اسی دوران

اللہ کے رسول ﷺ نے آیت نمبر 40، 41 کی تلاوت فرمائی:

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴾

''یہ ایک بزرگ رسول کا قول ہے۔ یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔''

اب دل میں خیال گزرا کہ اس نے تو میرے دل کی بات جان لی ہے۔ یقیناً یہ کاہن ہے۔ اب اللہ کے رسول ﷺ نے سورۂ حاقہ کی اگلی آیات کی تلاوت فرمائی:

﴿ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

''یہ کسی کاہن کا بھی قول نہیں ہے۔تم لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ تو اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا کلام ہے۔''

یہ آیات سن کر اسلام ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا۔

ایک اور واقعہ بخاری شریف کی حدیث: 3866 میں موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ میں بتوں کے قریب سو رہا تھا۔ ایک شخص ایک بچھڑا لایا۔ بت پر اسے ذبح کر دیا۔ اس کے حلق سے اس قدر زور کی آواز نکلی کہ میں نے ایسی شدید چیخ کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر یہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

(يا جَلِيحْ ، أمْرٌ نَجِيحْ ، رَجُلٌ فَصِيحٌ يقولُ: لا إله إلا الله)

''اے کھلے دشمن! ایک بات بتلاتا ہوں جس سے تجھے تیری مراد مل جائے۔ ایک فصیح وخوش بیان شخص یوں کہتا ہے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں'' یہ سنتے ہی تمام لوگ (جو وہاں موجود تھے) چونک پڑے اور وہاں سے چل دیے۔ میں نے کہا: میں تو نہیں جاؤں گا۔ دیکھوں گا کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، پھر یہی آواز آئی: ارے سخت دشمن! تجھے ایک بات بتلاتا ہوں جس سے مراد برآئے۔ایک فصیح شخص یوں کہہ رہا ہے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ۔اس وقت میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ لوگ کہنے لگے: یہ (محمد ﷺ) اللہ کے سچے رسول ہیں......اس صورتِ حال نے انھیں اسلام سے قریب تر کر دیا۔

اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کمال دانائی ثابت ہوئی۔ پکارنے والا کوئی فرشتہ تھا جو آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کی بشارت دے رہا تھا۔

ان کے اسلام لانے کا جو فوری سبب بنا وہ یہ ہے کہ ایک دن وہ خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا کام تمام کرنے کی نیت سے تلوار لے کر نکل پڑے۔ابھی راستے ہی میں تھے کہ نعیم بن عبد اللہ نحام عدوی سے ملاقات ہوگئی۔اس نے تیور دیکھ کر پوچھا: عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر نے کہا: محمد (ﷺ) کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ اس نے کہا: محمد (ﷺ) کو قتل کر کے بنو ہاشم اور بنو زہرہ سے کیسے بچ سکو گے؟ عمر نے کہا: معلوم ہوتا ہے تم بھی اپنا پچھلا دین چھوڑ کر بے دین ہو چکے ہو۔اس نے کہا: عمر! ایک عجیب بات نہ بتا دوں۔ تمھاری بہن اور بہنوئی بھی تمھارا دین چھوڑ

کر بے دین ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر عمر غصے سے بے قابو ہو گئے۔ سیدھے بہن اور بہنوئی کے گھر پہنچے۔ وہاں انھیں حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سورہ طٰہٰ پر مشتمل ایک صحیفہ پڑھا رہے تھے۔ قرآن پڑھانے کے لیے وہاں آنا جانا حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا معمول تھا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے عمر بن خطاب جیسے جری انسان کی آہٹ سنی تو گھر کے ایک گوشے میں چھپ گئے۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا نے صحیفہ چھپا دیا۔ لیکن عمر گھر کے قریب پہنچ کر حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی قراءت سن چکے تھے، چنانچہ پوچھا: یہ دھیمی دھیمی آواز کیسی تھی جو تم لوگوں کے ہاں میں نے سنی تھی؟ انھوں نے کہا کچھ نہیں۔ بس ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: غالباً تم دونوں بے دین ہو چکے ہو۔ بہنوئی نے پوچھا: اچھا عمر! یہ بتاؤ اگر حق تمھارے دین کے بجائے کسی اور دین میں ہو تو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اتنا سننا تھا کہ اپنے بہنوئی پر چڑھ بیٹھے اور انھیں بری طرح مارنے لگے۔ ان کی بہن نے لپک کر بھائی کو اپنے شوہر سے الگ کیا تو بہن کو ایسا چانٹا مارا کہ چہرہ خون آلود ہو گیا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ ان کے سر میں چوٹ آئی۔ بہن نے جوشِ غضب میں کہا: عمر! اگر تیرے دین کے بجائے دوسرا ہی دین برحق ہو تو؟ اور پھر بلند آواز سے کلمہ توحید پکارا: (أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ) میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ اور میں شہادت دیتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ انھیں اپنی بہن کے چہرے پر خون دیکھ کر شرم

بھی محسوس ہوئی۔ کہنے لگے۔ اچھا یہ کتاب جو تمھارے پاس ہے ذرا مجھے بھی پڑھنے کو دو۔ بہن نے کہا: تم ناپاک ہو۔ اس کتاب کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ اٹھو پہلے غسل کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کیا، پھر کتاب لی اور پڑھنے لگے۔ کہنے لگے: یہ تو بڑے پاکیزہ نام ہیں۔ اس کے بعد سورہ طٰہ سے ﴿ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴾ تک کی قراءت کی۔ کہنے لگے: یہ تو بڑا عمدہ اور بڑا محترم کلام ہے۔ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ بتاؤ!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ فقرے سن کر حضرت خباب رضی اللہ عنہ اندر سے باہر آ گئے۔ کہنے لگے: عمر خوش ہو جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات کی رات تمہارے بارے میں جو دعا کی تھی (کہ اے اللہ! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعے اسلام کو قوت پہنچا) وہ تمہارے حق میں قبول ہو گئی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا کے پاس دارارقم میں تشریف فرما ہیں۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار حمائل کی۔ اور اس گھر کے پاس پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ ایک آدمی نے اٹھ کر دروازے کی جھری سے جھانکا تو دیکھا کہ عمر تلوار حمائل کیے موجود ہیں۔ لپک کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ سارے لوگ سمٹ کر یکجا ہو گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا: عمر آئے ہیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بس! عمر ہے۔ دروازہ کھول دو۔ اگر وہ خیر کی نیت سے آیا ہے تو اسے ہم عطا کریں گے۔ اور اگر کوئی برا ارادہ لے کر آیا ہے تو ہم اسی کی تلوار ہی سے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ ادھر رسول اللہ

ﷺ اندر تشریف فرما تھے۔ آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ وحی نازل ہوچکی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے۔ بیٹھک میں ان سے ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان کے کپڑے اور تلوار پکڑ کر انھیں سختی سے جھٹکتے ہوئے فرمایا: عمر! کیا تم اس وقت تک باز نہیں آؤ گے جب تک اللہ تعالیٰ تم پر بھی ویسی ہی ذلت ورسوائی اور عبرتناک سزا نازل نہ فرما دے جیسی ولید بن مغیرہ پر نازل ہوچکی ہے؟ یا اللہ! یہ عمر بن خطاب ہے۔ یا اللہ! اسلام کو عمر بن خطاب کے ذریعے قوت وعزت عطا فرما۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اُنھوں نے بلند آہنگی سے کہا: (أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ) ”میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ اور یقیناً آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“ یہ سن کر گھر کے اندر موجود صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ مسجد الحرام والوں کو بھی سنائی دیا۔ معلوم رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زور آوری کا حال یہ تھا کہ کوئی ان سے مقابلے کی جرأت نہ کرتا تھا، اس لیے ان کے مسلمان ہوجانے سے مشرکین میں کہرام مچ گیا اور انھیں بڑی ذلت ورسوائی محسوس ہوئی۔

دوسری طرف ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بڑی عزت وقوت، شرف واعزاز اور مسرت وشادمانی نصیب ہوئی۔ ابنِ اسحاق نے اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: جب میں مسلمان ہوا تو میں نے سوچا کہ مکے کا کون شخص رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا اور سخت ترین دشمن ہے؟

پھر میں نے جی ہی جی میں کہا: یہ ابوجہل ہے۔ اس کے بعد میں اس کے گھر گیا۔ اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر بولا: (أَهْلًا وَسَهْلًا) "خوش آمدید، خوش آمدید"۔ کیسے آنا ہوا؟ میں نے کہا: تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لا چکا ہوں۔ اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ (یہ سنتے ہی) اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ اور بولا: اللہ تیرا برا کرے اور جو کچھ تو لے کر آیا ہے اس کا بھی برا کرے۔

امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب کوئی شخص مسلمان ہو جاتا تو لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ اسے زدوکوب کرتے، اور وہ بھی جواباً انہیں مارتا تھا، اس لیے جب میں مسلمان ہوا تو اپنے ماموں عاصی بن ہاشم کے پاس گیا اور اسے اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع دی۔ وہ مجھ سے مُنہ موڑ کر گھر کے اندر گھس گیا، پھر میں قریش کے ایک بڑے آدمی کے پاس گیا۔ اسے خبر دی۔ وہ بھی گھر کے اندر گھس گیا۔

ابن ہشام اور ابن جوزی کا بیان ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو جمیل بن معمر جمحی کے پاس گئے۔ یہ شخص کسی بات کا ڈھول پیٹنے میں پورے قریش میں سب سے آگے تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اس نے سنتے ہی بڑے زور سے چیخ کر کہا: خطاب کا بیٹا بے دین ہو گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ بولے: یہ جھوٹ کہتا ہے۔ میں

تو مسلمان ہوا ہوں۔ یہ سُن کر لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے۔ اور مار پیٹ شروع ہوگئی۔ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مار رہے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی پٹائی کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ سورج سر پر آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھک کر بیٹھ گئے۔ لوگ سر پر سوار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا جو بن پڑے کر لو۔ اللہ کی قسم! اگر ہم لوگ تین سو کی تعداد میں ہوتے تو پھر مکے میں تم رہتے یا ہم ہی رہتے۔

اس کے بعد مشرکین نے اس ارادے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر پر ہلہ بول دیا کہ انھیں جان سے مار ڈالیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر کے اندر تھے کہ اس دوران ابوعَمر و عاص بن وائل سہمی آ گیا۔ وہ دھاری دار یمنی چادر کا جوڑا اور ریشمی گوٹے سے آراستہ کرتا زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ بنوسَہم سے تھا اور یہ قبیلہ زمانۂ جاہلیت میں ہمارا حلیف تھا۔ اس نے پوچھا: کیا بات ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں مسلمان ہوگیا ہوں، اس لیے آپ کی قوم مجھے قتل کرنا چاہتی ہے۔ عاص نے کہا: یہ ناممکن ہے۔ عاص کی یہ بات سن کر مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد عاص وہاں سے نکلا۔ لوگوں سے ملا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ لوگوں کی بھیڑ سے وادی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ عاص نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ لوگوں نے کہا: ہمیں خطاب کا بیٹا مطلوب ہے جو بے دین ہوگیا ہے۔ عاص نے کہا: اس طرف کوئی راہ نہیں (یعنی میں عمر کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں) یہ سنتے ہی لوگ واپس چلے گئے۔ [1]

---

[1] دلائل النبوۃ للبیهقي: 2/215-221، وأسد الغابة: 4/139-142.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر یہ کیفیت تو مشرکین کی ہوئی، رہے مسلمان تو ان کے احوال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مجاہد رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کس وجہ سے آپ کا لقب فاروق پڑا؟ انھوں نے کہا: مجھ سے تین دن پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کر کے آخر میں کہا: جب میں مسلمان ہوا تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں، خواہ زندہ رہیں خواہ مریں ؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم لوگ حق پر ہو، خواہ زندہ رہو یا موت سے دوچار ہوجاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اُسی وقت میں نے کہا: پھر چھپنا کیسا ؟ اس ذات کی قسم! جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! ہم ضرور باہر نکلیں گے، چنانچہ ہم دو صفوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمراہ لے کر باہر آئے۔ ایک صف میں حمزہ رضی اللہ عنہ تھے اور ایک میں میں تھا۔ ہمارے چلنے سے چکی کے آٹے کی طرح ہلکا ہلکا غبار اڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ قریش نے مجھے اور حمزہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو ان کے دلوں پر ایسی چوٹ لگی کہ اب تک نہ لگی تھی وہ لوگ مرجھا کر رہ گئے۔ بس اسی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا لقب فاروق رکھ دیا۔ [1]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہم خانۂ کعبہ کے پاس نماز

---

[1] الإصابۃ مختصراً: 2/519.

پڑھنے پر قادر نہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ہم خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے لگے۔ [1]

حضرت صُہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو اسلام پردے سے باہر آ گیا۔ اس کی علانیہ دعوت دی گئی۔ ہم حلقے لگا کر بیت اللہ کے گرد بیٹھے، بیت اللہ کا طواف کیا اور جس نے ہم پر سختی کی ہم نے اس سے انتقام لیا۔ اور اس کے مظالم کا جواب دیا۔ [2]

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اُس وقت سے ہم برابر طاقتور اور باعزت ہوتے چلے گئے۔

---

[1] أسد الغابة: 4/144.

[2] صحيح البخاري، حديث: 3684. السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية، ص: 215.

حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں لوہار تھا۔ میرا عاص پر کچھ قرضہ تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔قرضے کی واپسی کا تقاضا کیا۔'' اس نے کہا کہ میں اس وقت تک قرضہ ادا نہیں کروں گا جب تک تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کرو گے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں ان کا انکار ہرگز نہیں کروں گا۔ چاہے تو مر جائے اور پھر زندہ کیا جائے۔'' (میں قیامت تک انکار نہیں کر سکتا) اس نے کہا: ''اچھا! تو کیا میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا؟ اگر یہ بات ہے تو پھر اس وقت میرے پاس مال بھی ہوگا، اولاد بھی ہوگی، پھر میں تمھارا قرضہ ادا کر دوں گا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات مبارکہ نازل فرمائیں:

﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ

لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا﴾

’’کیا آپ ﷺ نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور یہ کہا کہ مجھے (دوسری زندگی میں) مال اور اولاد ملے گی، کیا اس نے غیب کی بات معلوم کر لی ہے، یا رحمٰن سے کوئی عہد لے لیا ہے۔ ہرگز نہیں، جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ہم لکھ رہے ہیں اور اس کے لیے عذاب کو آہستہ آہستہ بڑھاتے چلے جائیں گے اور جو چیزیں یہ بتا رہا ہے اس کے وارث ہم ہوں گے اور یہ تو ہمارے سامنے اکیلا حاضر ہو گا۔‘‘[1]

[1] (مریم 19: 77-80) صحیح البخاري، حدیث: 2091، وصحیح مسلم، حدیث: 2795.

24

ابولہب کے بیٹوں میں سے ایک کا نام عُتیبہ تھا۔ یہ بد بخت نبی ﷺ کی ایذا رسانی میں سب سے آگے اور گستاخیٔ رسالت میں بڑا بے باک تھا۔ اس نے ایک دن یہ ناپاک جسارت کی کہ نبی ﷺ کی قمیص مبارک کو پھاڑ دیا اور آپ ﷺ کے رُوئے زیبا پر تھوکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس وحشیانہ گستاخی پر آپ ﷺ نے اس کے حق میں یہ بد دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْهِ کَلْبًا مِّنْ کِلَابِکَ"
''اے میرے پروردگار! اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلط کردے۔''

مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام گیا۔ جب راستے میں ''الزرقاء'' نامی جگہ پر قافلے نے پڑاؤ ڈالا۔ عتیبہ کو جنگل کی اس دہشت ناک فضا میں رسول اللہ ﷺ کی بددعا یاد آئی۔ وہ خوف سے کانپنے لگا، چنانچہ اسے اس بد دعا کے خوف سے اونٹوں اور قافلہ والوں کے حصار میں بڑی حفاظت سے

سلایا گیا مگر اس تدبیر پر تقدیر غالب رہی۔ رات کو اس طرف ایک شیر آ نکلا۔ قافلے والوں نے اسے دیکھا تو وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ اور عتیبہ کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے وہ بدحواس ہو کر چیخنے لگا: واللہ! یہ شیر مجھے محمد ﷺ کی بددعا کے نتیجے میں کھا جائے گا، ہرچند وہ مکہ میں ہیں اور میں یہاں شام میں ہوں مگر یہ شیر مجھے نہیں بخشے گا......۔ ایسا ہی ہوا۔ وہ شیر سارے قافلے کو پھلانگتا ہوا سیدھا عتیبہ کی طرف جھپٹا اور دیکھتی آنکھوں اُس نے عتیبہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔[1]

[1] دلائل النبوۃ للبیھقي: 2/339، مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ، ص:135، والرحیق المختوم، ص:149.

ابو طالب کے گھر قریش کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں ایک نہایت خوبصورت اور سجیلا نوجوان عُمارہ بن ولید بھی تھا ۔ یہ لوگ نہایت عجیب و غریب مطالبہ اور تاریخ کے عجیب ترین سودے کی پیشکش لے کر آئے تھے۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا: اس خوبصورت نوجوان کو اپنے بھتیجے کی جگہ رکھ لیجیے۔ اور محمد کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ تاکہ ہم اسے قتل کر دیں۔ اس کے بدلے میں عمارہ آپ کو دے دیا جائے گا۔ اس کی دیت اور نصرت کے آپ حقدار ہوں گے۔ آپ اسے اپنا بیٹا بنا لیں۔ آپ کے بھتیجے نے آپ کے آباءواجداد کے دین کی مخالفت کی ہے۔ آپ کی قوم کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ ان کی عقلوں کو حماقت سے دوچار بتلایا ہے۔ اس کی سزا قتل ہے۔

ابو طالب گہری سوچ میں غرق تھے انھوں نے قریش کی ہرزہ سرائی سُنی ، پھر سر

اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ یہ عام لوگ نہیں تھے جو ان کے پاس یہ شرارت بھرا احمقانہ مطالبہ لے کر آئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے سردار اور مکہ کے دانشور کہلانے والے لوگ موجود تھے۔ ابو طالب نے بلند آہنگی سے کہا: اللہ کی قسم! یہ سودا کتنا بُرا ہے جو تم لوگ مجھ سے کرنا چاہتے ہو!! تم کیسے لوگ ہو؟ اپنا بیٹا میرے حوالے کرتے ہو تاکہ میں اسے کھلاؤں پلاؤں اور پال پوس کر اس کی خدمت کروں اور میرا بیٹا مجھ سے طلب کرتے ہو تاکہ تم اسے قتل کر دو۔ اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ عبد مناف کا پڑپوتا مطعم بن عدی بولا: ابو طالب! تمھاری قوم نے تم سے انصاف کی بات کہی ہے لیکن تم ان کی کوئی بات قبول کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے جواب میں ابو طالب نے کہا: واللہ! تم لوگوں نے مجھ سے انصاف کی بات نہیں کی۔ تم میرے مخالف لوگوں کی مدد پر تلے بیٹھے ہو۔ ٹھیک ہے جو چاہو کرو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ اور ابو طالب کو یہ لوگ آئے دن طرح طرح کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ قریش دعوت حق کو روکنے کے لیے ہر حربہ اختیار کر رہے تھے۔ قریش کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو محمد رسول اللہ کی دعوت کو بزور طاقت روک دیں۔ یا آپ ﷺ کو قتل کر دیں۔ دوسری صورت آسان نہ تھی۔ ابو طالب آپ ﷺ کے محافظ تھے۔ اور کفار کے عزائم کے آگے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوئے تھے۔

چند دن پہلے والی ملاقات میں بھی سرداران قریش نے ابو طالب کو کھلی دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ آپ کا مقام و مرتبہ ہمارے نزدیک بڑا اہم ہے۔ آپ

ہمارے درمیان بڑے شرف والے ہیں آپ کی عمر کا تقاضا بھی ہے کہ آپ کا اکرام کیا جائے۔ آپ کو ہم نے کئی بار کہا ہے کہ اپنے بھتیجے کو روکیے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اب یہ معاملہ ہماری برداشت سے باہر ہے۔ کہ ہمارے آباء واجداد کو گالیاں دی جائیں، ہماری عقل اور فہم کو حماقت زدہ قرار دیا جائے۔ ہمارے خداؤں کی عیب چینی کی جائے۔ اپنے بھتیجے کو روکیے ورنہ ہم آپ سے اور ان سے مقابلہ کریں گے اور ایسی جنگ چھیڑ دیں گے کہ کسی ایک فریق کا صفایا ہو کر رہے گا۔

ابو طالب پر اس دھمکی کا بڑا اثر پڑا۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو بلایا اور کہا قریش کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور یہ یہ باتیں کہہ گئے ہیں۔ اب میرے اوپر اور خود اپنے آپ پر رحم کرو۔ اس معاملے میں مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میرے بس سے باہر ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جواب میں فرمایا: اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اس کام کو پورا کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا چاہے میں اس راہ میں فنا ہو جاؤں۔

اس کے بعد آپ ﷺ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں آپ ﷺ رو پڑے اور پھر اٹھ گئے۔ واپس جانے لگے تو ابو طالب نے پکارا۔ آپ تشریف لائے تو کہا: بھتیجے جاؤ، جو چاہو کہو اللہ کی قسم! میں تمھیں کبھی کسی وجہ سے ہرگز نہیں چھوڑوں گا، پھر انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی ہمت افزائی کے لیے اشعار کہے۔[1]

---

[1] البداية والنهاية: 3/55.

26

سارے گستاخ تڑپ تڑپ کر مر گئے

تفسیر و تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں درج ہے کہ مکہ مکرمہ میں چند شر پسند سردار آنحضرت ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرتے اور مختلف قسم کی ایذا رسانی کے ساتھ ساتھ برسرِ عام آپ ﷺ کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ یہ کیفیت آنحضرت ﷺ کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ خود باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾

''ہمیں معلوم ہے کہ ان کی (تکلیف دہ) باتوں سے آپ کا سینہ تنگ پڑ رہا ہے۔'' [1]

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴾

''ان مذاق اڑانے والوں کے لیے آپ کی خاطر ہم کافی ہیں۔'' [1]

---

① الحجر 97:15

اسود بن ابی زمعہ، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور حارث بن قیس بن طلاطلہ، یہ پانچوں سردار آنحضرت ﷺ کا مذاق اڑانے والوں میں پیش پیش تھے۔ ایک دن آپ ﷺ کے پاس جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے، آپ ﷺ نے ان سرداروں کی شکایت کی، پھر (راہ چلتے) آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ولید بن مغیرہ دکھایا تو انھوں نے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا، آپ ﷺ نے پوچھا: جبریل یہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ کے حکم سے آپ ﷺ کی طرف سے میں اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں، پھر آپ ﷺ نے انھیں حارث دکھایا تو جبریل علیہ السلام نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تم نے یہ کیا کیا؟ انھوں نے جواب دیا: آپ ﷺ کی طرف سے میں اس کے لیے کافی ہوں۔ آپ ﷺ نے انھیں عاص بن وائل دکھایا۔ انھوں نے اس کی ایڑی کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا: اس کا مطلب کیا؟ انھوں نے جواب دیا: میں آپ کی طرف سے اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں، پھر آپ ﷺ نے انھیں اسود بن مطلب دکھایا۔ انھوں نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کیا؟ انھوں نے وہی جواب دیا کہ آپ کی طرف سے میں اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں، پھر آپ نے انھیں اسود بن عبد یغوث دکھایا تو انھوں نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: میں اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں۔

اس کے بعد ان بدبختوں کا انجام کیا ہوا؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ سب

لوگ انہی اعضائے جسم کی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو کر واصل جہنم ہوئے جن کی طرف جبریل امین نے اشارہ کیا تھا۔ ولید بن مغیرہ کے پاؤں میں بھالا لگا۔ اس کی رگ کٹ گئی۔ وہ اسی سے مر گیا، حارث کے پیٹ میں پانی بھر گیا حتی کہ منہ سے گندگی نکلنے لگی۔ وہ اسی حالت میں مرا۔ عاص کے پاؤں میں کانٹا نما کوئی چیز چبھی۔ زخم پھیل گیا۔ وہ اسی سے مر گیا۔ اسود بن عبدالمطلب ایک درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اچانک چیخنے لگا: بیٹا! مجھے بچاؤ۔ میری آنکھ میں کانٹا چبھ گیا ہے۔ سخت تکلیف دے رہا ہے۔ اس نے کہا: ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ اسی تکلیف سے اندھا ہو گیا۔ اسی طرح اسود بن عبد یغوث کے سر میں پھوڑا نکلا اور وہ اسی زخم کی اذیت سے جہنم کی غذا بن گیا۔[1]

یہ سب کے سب گستاخان نبوت قدرت کے انتقام کا نشانہ بنے۔ ہر چند کہ یہ کسی مسلمان کے ہاتھوں جہنم رسید نہیں ہوئے مگر خود اللہ تعالیٰ نے ان پر مختلف قسم کے عذاب مسلط کر دیے اور انھیں رسوائی کی موت مار دیا تاکہ وہ بعد میں آنے والے گستاخان رسالت مآب ﷺ کے لیے نشان عبرت بن جائیں۔ اگر اس قسم کے گستاخ اور بے ادب لوگ کسی مسلمان کے جذبۂ ایمان کے جوش انتقام سے بچ بھی گئے تو اللہ تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ اپنے لاتعداد لشکروں میں سے کسی بھی لشکر کو گستاخ رسول ﷺ پر مسلط کر دیتا ہے۔

---

[1] دلائل النبوۃ للبیہقي: 2/316-318.

ایک مرتبہ کافروں نے کہا: ہم آپ ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ اللہ نے فرمایا کہ (اے رسول ﷺ!)

﴿ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴾

''ان سے کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر قائم ہوں۔ تم نے اسے جھٹلایا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں کہ تمھیں عذاب میں مبتلا کر دوں جس کی تم جلدی کر رہے ہو۔ حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے۔ وہ سچی بات بیان کرتا ہے اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اگر میرے اختیار میں وہ عذاب ہوتا جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو کبھی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا (لیکن اللہ بہت حلیم اور عالی ظرف ہے کہ عذاب میں تاخیر کر رہا ہے) بہرحال اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے (وہ انھیں وقت مقررہ پر سزا دے گا)'' [1]

---

[1] الأنعام 6:57،58.

غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جا رہی تھیں۔ ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ تبلیغِ دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھیں۔ اسی اثنا میں عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ چونکہ ان دنوں بتوں کی پوجا عام تھی، اِس لیے عمرو ایام جاہلیت ہی سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ سب لوگ گمراہی پر ہیں۔ صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ جب عمرو رضی اللہ عنہ نے سنا کہ مکہ میں ایک شخص (آسمانی) خبریں بیان کرتا ہے تو وہ اپنی سواری پر بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں رسول اللہ ﷺ پوشیدہ رہ کر رازداری کے ساتھ تبلیغ دین کا کام کر رہے تھے اور کفار قریش کی اُن ﷺ پر کڑی نظر تھی۔ بہر حال (مَنْ جَدَّ وَجَدَ) یعنی جوئندہ پایندہ کہ جسے کسی کی تلاش و جستجو ہوتی ہے، وہ اُسے بہر حال پالیتا ہے۔ عمرو اپنی دُھن کے پکے تھے۔ وہ مکہ مکرمہ پہنچے اور کسی نہ کسی طریقے سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے آپ ﷺ سے پوچھا:

''آپ کون ہیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نبی ہوں۔''

انھوں نے پوچھا:

''نبی کیا ہوتا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اللہ نے (ہادی بنا کر بھیجا) ہے۔''

انھوں نے پوچھا: اللہ نے کیا چیز دے کر آپ کو بھیجا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ان باتوں کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ صلہ رحمی کی جائے، بتوں کو توڑا جائے، اللہ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کیا جائے۔''

انھوں نے پوچھا: آپ ﷺ کے ساتھ اس دین پر کون کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' آزاد بھی ہیں، غلام بھی ہیں۔''

یہ ارشادات سُن کر عمرو بن عبسہ اُسی دن مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ انھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ اسلام لانے والوں میں چوتھی شخصیت ہیں۔ سیدنا ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما ان سے قبل ایمان لا چکے تھے۔

عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ ﷺ کی پیروی کرتا ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج کے حالات میں تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرا اور لوگوں کا کیا حال ہے؟ (سب لوگ میرے مخالف ہیں اسی وجہ سے کہیں تم بھی مصائب میں مبتلا نہ ہو جاؤ)، اس لیے اب تم اپنے گھر چلے جاؤ، پھر جب تم سنو کہ میں غالب آ گیا ہوں تو پھر تم میرے پاس آ جانا۔ غرض یہ کہ وہ اپنے گھر واپس چلے گئے۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 832.

28

رسول اللہ ﷺ نے بادشاہت ٹھکرادی

ایک دن قریش کے ایک بڑے سردار عتبہ بن ربیعہ نے قریش سے پوچھا: کیوں نہ میں محمد کے ساتھ گفتگو کروں اور انہیں کچھ لے دے کر اسلام کی دعوت دینے سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے؟

قریش نے کہا: ابوالولید! ضرور جائیے اور محمد سے بات کیجیے۔ اس کے بعد عتبہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: بھتیجے! تمہیں جو عزت و شرف اور مقام و مرتبہ اپنے خاندان میں حاصل ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو۔ تمہارا نسب نامہ نہایت بلند پایہ ہے۔ اب تم ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کی وجہ سے قوم میں تفرقہ پیدا ہو گیا ہے۔ تم نے ان کے معبودوں کو جھٹلایا۔ اپنے آباء و اجداد کو کافر قرار دیا۔ میں تمھارے سامنے کچھ چیزیں پیش کرتا ہوں۔ ان پر خوب غور کرو۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی بات تمہیں پسند آجائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

ابوالولید تم کہو، میں سنوں گا۔

عتبہ کہنے لگا: جو دعوت تم لے کر آئے ہو اگر اس سے مال حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار بن جاؤ گے۔ اگر سرداری درکار ہے تو ہم متفقہ طور پر تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ ہمارا ہر معاملہ تمہارے مشورے اور حکم سے طے پائے گا۔ اگر تم کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو مکہ کی جس لڑکی کی طرف اشارہ کرو اس سے تمہیں بیاہ دیتے ہیں۔ اور اگر تمہارے اوپر کسی جن بھوت کا سایہ ہے تو ہم تمہارا علاج کرانے کے لیے بھی تیار ہیں تاکہ تم شفایاب ہو جاؤ۔ عتبہ اپنی باتیں کہتا رہا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ اپنی لچھے دار باتوں سے محمد ﷺ کو کسی نہ کسی شرط پر راضی کر لے گا۔ اس نے اپنی ہفوات ختم کیں تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور دریافت فرمایا: ابوالولید کیا تمہاری بات ختم ہو گئی؟ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کچھ میری باتیں بھی سنو گے؟ اس نے کہا: ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ اب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی شیر وشہد جیسی آواز میں سورۂ حٰم سجدہ کی آیات کی تلاوت شروع کی:

"حٰم یہ رحمٰن اور رحیم کی طرف سے نازل کی ہوئی ایسی کتاب ہے۔ جس کی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ (یہ) عربی قرآن (ہے) ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہے لیکن اکثر لوگوں نے اعراض کیا اور وہ سنتے نہیں۔"[1]

اللہ کے رسول ﷺ پڑھتے جا رہے تھے اور عتبہ مبہوت ہو کر سن رہا تھا۔ جب سجدے کی آیت آئی تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور فرمایا: ابو الولید! تمھیں جو کچھ سننا تھا، سن چکے اب تم جانو اور تمہارا کام۔

قریش عتبہ کے منتظر تھے۔ جب اُسے واپس آتے دیکھا تو اس کے ظواہر (Body language) دیکھ کر کہنے لگے: اللہ کی قسم! یہ شخص جو چہرہ لے کر گیا تھا اب اس کے ساتھ واپس نہیں آ رہا۔ جب عتبہ واپس پہنچ کر ان لوگوں میں بیٹھ گیا تو انہوں نے پوچھا: ہاں ابو الولید! کیا خبر ہے؟ تمہاری پیشکش اور تمہاری تجاویز کا کیا بنا؟ عتبہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا: میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا آج تک نہیں سنا۔ خدا کی قسم! نہ تو وہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت، اے قریش! میری بات مانو۔ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ جو گفتگو میں نے سنی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا واقعہ رونما ہو کر رہے گا۔ اگر اسے عربوں نے مار ڈالا تو تمہارا کام دوسروں کے ہاتھوں انجام پا جائے گا۔ اور اگر یہ غالب آ گیا تو اس کی بادشاہت تمہاری اور اس کی عزت تمہاری ہی عزت کا باعث ہو گی۔ قریش نے اس کی طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا: تم پر بھی اس کی زبان کا جادو چل گیا ہے۔ عتبہ بولا: اب جیسے تمہاری مرضی، میں نے بہر حال اس کے بارے میں اپنی رائے دے دی ہے۔[1]

---

[1] تفسیر القرطبي: 15/296، و مجمع الزوائد: 6/20.

29

نضر بن حارث کا کردار

نضر بن حارث کا واقعہ یہ ہے کہ اس نے ایک بار قریش سے کہا: ''قریش کے لوگو! خدا کی قسم! تم پر ایسی افتاد آن پڑی ہے کہ تم لوگ اب تک اس کا کوئی توڑ نہیں کر سکے۔ محمد ﷺ جوان تھے تو تمھارے سب سے زیادہ پسندیدہ آدمی تھے۔ سب سے زیادہ سچے اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھے۔ اب ان کی کنپٹیوں پر سفیدی چمکنے والی ہے اور وہ ادھیڑ عمر ہو چلے ہیں اور تمھارے پاس چند باتیں لے کر آئے ہیں تو تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہیں۔ نہیں واللہ! وہ جادوگر نہیں۔ ہم نے جادوگر دیکھے ہیں۔ ان کی جھاڑ پھونک اور گرہ بندی بھی دیکھی ہے۔ تم لوگ کہتے ہو وہ کاہن ہیں۔ نہیں واللہ! وہ کاہن بھی نہیں۔ ہم نے کاہن بھی دیکھے ہیں، ان کی الٹی سیدھی حرکتیں بھی دیکھی ہیں اور ان کی فقرہ بندیاں بھی سنی ہیں۔ تم لوگ کہتے ہو وہ شاعر ہیں۔ نہیں واللہ! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے شعر بھی سُنے اور اس کے سارے اصناف، ھجز، رجز وغیرہ سے ہم خوب آگاہ ہیں۔ تم لوگ کہتے ہو وہ پاگل ہیں۔ نہیں، واللہ! وہ پاگل بھی نہیں، ہم نے پاگل پن بھی دیکھا ہے۔ یہاں نہ اس طرح کی گھٹن ہے نہ ویسی بہکی بہکی باتیں، نہ ان جیسی فریب کارانہ گفتگو۔ قریش

کے لوگو! سوچو! اللہ کی قسم تم پر زبردست افتاد آن پڑی ہے۔"

اس کے بعد نضر بن حارث حیرہ گیا، وہاں بادشاہوں کے واقعات اور رستم و اسفند یار کے قصے سُنے اور سیکھے، پھر واپس آیا۔ اب اس کا معمول یہ ہوگیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی باتیں کرتے اور اس کی گرفت سے لوگوں کو ڈراتے تو آپ ﷺ کے ارشادات کے بعد یہ شخص وہاں پہنچ جاتا اور کہتا: واللہ! محمد ﷺ کی باتیں مجھ سے بہتر نہیں۔ اس کے بعد وہ فارس کے بادشاہوں اور رستم و اسفند یار کے قصے کہانیاں سناتا، پھر کہتا: آخر کس بنا پر محمد ﷺ کی بات مجھ سے بہتر ہے؟[1]

ابن عباس کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نضر نے چند لونڈیاں خرید رکھی تھیں۔ جونہی وہ کسی آدمی کے متعلق سنتا کہ وہ نبی ﷺ کی طرف مائل ہے تو اس پر ایک لونڈی مسلط کر دیتا جو اسے کھلاتی پلاتی رجھاتی اور گانے سناتی یہاں تک کہ اسلام کی طرف اس کا جھکاؤ باقی نہ رہنے دیتی۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد اسی سلسلے میں نازل ہوا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو کھیل تماشے کی بات خریدتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکائیں۔"[2]

---

① السيرة النبوية لابن هشام: 1/299,300، 358.

② الدر المنثور: 5/307.

③ سورة لقمان: 31:6

عُقبہ بن ابی مُعیط اپنی بدبختی اور خباثت میں حد سے بڑھا ہوا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور ابوجہل اور اس کے کچھ رفقاء بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ بعض نے بعض سے کہا: کون ہے جو بنو فلاں کے اونٹ کی اوجھڑی لائے اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کریں تو ان کی پیٹھ پر ڈال دے؟ اس پر بدبخت ترین شخص عقبہ بن ابی معیط اٹھا۔ اوجھ اُٹھا لایا اور انتظار کرنے لگا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گئے تو اس نے اسے آپ کی پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ڈال دیا۔ میں یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ کاش مجھ میں رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کی طاقت ہوتی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ہنسی کے مارے ایک

دوسرے پر گرنے لگے۔ اور رسول اللہ ﷺ سجدے ہی میں پڑے رہے۔ سَر نہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں۔ انھوں نے آپ ﷺ کی پیٹھ سے اوجھ ہٹا کر پھینکی تب آپ نے سَر اٹھایا، پھر تین بار فرمایا: (اَللّٰھُمَّ عَلَیْكَ بِقُرَیْشٍ) ''اے اللہ! قریش کو پکڑ لے۔'' آپ ﷺ نے بددعا کی تو ان پر بہت گراں گزری۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کے اس گھر میں دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے نام لے لے کر بددعا کی: اے اللہ! ابوجہل کو پکڑ لے۔ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ لے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کے نام رسول اللہ ﷺ نے گن گن کر لیے تھے، وہ سب کے سب مقتول ہو کر بدر کے گندے کنویں میں پڑے تھے۔ ان بدبختوں میں عقبہ بن ابی معیط بھی شامل تھا۔[1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 240، 3185.

31

ابوجہل کے کرتوت

ابوجہل کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا تھا اور قرآن سنتا تھا۔ بس سنتا ہی تھا۔ آگے نہیں بڑھتا تھا۔ ایمان واطاعت اور ادب وخشیت اختیار کرنا تو اس کی قسمت میں ہی نہ تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی باتوں سے اذیت پہنچاتا اور اللہ کی راہ سے روکتا تھا، پھر اپنی اس گھٹیا حرکت پر فخر بھی کرتا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیات اسی شخص کے بارے میں نازل ہوئیں:

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝٣١ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝٣٢ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝٣٣ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝٣٤ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾

''نہ اس نے سچ مانا، نہ نماز پڑھی۔ بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ پھیری، پھر وہ اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔ تیرے لیے ہلاکت در ہلاکت ہے،

پھر تیرے لیے ہلاکت در ہلاکت ہے۔“

اس شخص نے پہلے دن جب نبی ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اسی دن سے آپ ﷺ کو نماز سے روکنے لگا۔ ایک دفعہ نبی ﷺ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ اس کا گزر ہوا۔ دیکھتے ہی بولا: محمد! کیا میں نے تجھے اس سے منع نہیں کیا تھا؟ ساتھ ہی دھمکی بھی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ڈانٹ کر سختی سے جواب دیا۔ اس پر وہ کہنے لگا: اے محمد! کاہے کی دھمکی دے رہے ہو، دیکھو اللہ کی قسم! اس وادی (مکہ) میں میرا جتھا سب سے بڑا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴾ ”اچھا! تو بلا لے اپنی ٹولی کو ہم بھی عنقریب سزا کے فرشتوں کو بلالیں گے۔“[1]

ایک روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾

”تیرے لیے بہت ہی موزوں ہے۔ تیرے لیے بہت ہی موزوں ہے۔“

اس پر اللہ کا دشمن کہنے لگا: اے محمد! مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ اللہ کی قسم! تم اور تمھارا پروردگار میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں مکے کی دونوں پہاڑیوں کے مابین چلنے پھرنے والوں میں سب سے زیادہ معزز ہوں۔[2]

---

[1] القيامة 75/31-35. [2] جامع الترمذي، حديث: 3349.

[3] تفسیر ابن کثیر: 4/477، والدرالمنثور: 6/478.

بہرحال اس ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے باوجود ابوجہل اپنی حماقت سے باز نہیں آیا۔ بلکہ اس کی بدبختی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار ابوجہل نے سردارانِ قریش سے کہا: محمد آپ لوگوں کے رُوبرو اپنا چہرہ خاک آلود کرتا ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں، اس نے کہا: لات وعزی کی قسم! اگر میں نے (اس حالت میں) اسے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا۔ اور اس کا چہرہ مٹی پر رگڑ دوں گا۔ اس کے بعد اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور اس زعم میں چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن روند دے گا۔ لیکن لوگوں نے اچانک کیا دیکھا کہ وہ ایڑیوں کے بل پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کر رہا ہے۔ لوگوں نے کہا: ابوالحکم! تمھیں کیا ہوا؟ اس نے کہا: میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق ہے۔ ہولناکیاں ہیں۔ اور پَر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب آجاتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو نوچ لیتے۔[1]

ابوجہل جب کسی معزز اور طاقتور آدمی کے مسلمان ہونے کی خبر سنتا تو اسے برا بھلا کہتا ذلیل و رسوا کرتا اور مال و جان کو سخت خسارے سے دو چار کرنے کی دھمکیاں دیتا اور اگر کوئی کمزور آدمی مسلمان ہوتا تو اسے مارتا پیٹتا اور دوسروں کو بھی بدسلوکی پر اُکساتا تھا۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث:2797.

32

لکڑیاں ڈھونے والی بد بخت عورت

ابولہب کی بیوی ام جمیل کا نام اروی تھا وہ حرب بن امیہ کی بیٹی اور ابوسفیان کی بہن تھی، وہ بھی نبی ﷺ کی عداوت میں اپنے شوہر سے پیچھے نہ تھی۔ وہ بد بخت رات کے وقت نبی ﷺ کے راستے اور دروازے پر کانٹے ڈال دیا کرتی تھی۔ بدزبان اور جھگڑالو تو تھی ہی، چنانچہ نبی ﷺ کے خلاف بدزبانی کرنا، لمبی چوڑی دسیسہ کاری وافترا پردازی سے کام لینا، فتنے کی آگ بھڑکانا، اور خوفناک جنگ بپا رکھنا اس کا شیوہ تھا۔ اسی لیے قرآن نے اس کا ذکر ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ ''لکڑی ڈھونے والی'' (چغل خور) کے لقب سے کیا ہے۔

جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی اور اس کے شوہر کی مذمّت میں قرآن نازل ہوا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتی ہوئی آئی۔ آپ ﷺ مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے پاس تشریف فرما تھے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ مُٹھی

میں پتھر لیے ہوئے تھی۔ سامنے کھڑی ہوئی تو اللہ نے اس کی نگاہ پر پردہ ڈال دیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھ سکی۔ صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کو دیکھتی رہی۔ اس نے سامنے پہنچتے ہی سوال کیا: ابوبکر تمھارا ساتھی کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ہجو کرتا ہے۔ واللہ! اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو اسکے منہ پر یہ پتھر دے ماروں گی۔ دیکھو! اللہ کی قسم! میں بھی شاعرہ ہوں، پھر اس نے یہ شعر سنایا۔

(مُذَمَّمًا عَصَيْنَا۔ وَأَمْرَهُ أَبَيْنَا۔ وَدِينَهُ قَلَيْنَا)

''ہم نے مذمم کی نافرمانی کی۔ اس کے حکم کو تسلیم نہ کیا اور اس کے دین کو نفرت وحقارت سے چھوڑ دیا۔''

اس کے بعد یہ بدفطرت عورت واپس چلی گئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا اس نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اللہ نے اس کی نگاہ معطل کر دی تھی۔[1]

امام ابوبکر بزّار نے بھی یہ واقعہ روایت کیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ جب وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہوئی تھی تو اس نے یہ بھی کہا: ابوبکر! تمھارے ساتھی ﷺ نے ہماری ہجو کی ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں اس عمارت کے رب کی قسم، نہ وہ شعر کہتے ہیں نہ اسے زبان پر لاتے ہیں۔ اس نے کہا: تم سچ کہتے ہو (مطلب یہ تھا کہ تمہارے بارے میں جو کہا اللہ تعالی نے کہا، محمد ﷺ نے اپنی

---

[1] السيرة النبوية لابن ہشام: 356/1.

طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہا)۔[1]

کسی شاعر نے ام جمیل کے اس ہذیان کا جواب یوں دیا ہے:

(مُحَمَّدًا أَطَعْنَا۔ وأَمْرَهُ قَبِلْنَا۔ وَدِينَهُ رَضِينَا۔ وَنَفْسَهُ فَدَيْنَا)

''ہم نے محمد ﷺ ہی کی اطاعت کی، انہی کے حکم کو قبول کیا۔ان کے دین پر ہم راضی ہوئے۔ان پر ہماری جانیں قربان ہوں''۔

---

[1] المستدرك للحاكم: 361/2، ومصنف ابن أبي شيبة: 498/11، حديث:11817، وفي السياق اختلاف يسير.

ابولہب غارت ہوا

نبی اکرم ﷺ کے اعلان نبوت پر آپ کی مخالفت کرنے والا سب سے پہلا شخص آپ کا حقیقی چچا ابولہب تھا اس شخص نے ایک طرف تو آپ ﷺ کی ولادت کی خوشی میں اپنی لونڈی آزاد کی مگر دوسری طرف اعلان نبوت پر پہلی ہی دعوتی مجلس میں نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب بھی کیا اور پھر اس کا سارا گھرانہ ہی پیغمبر ﷺ کی شان اقدس میں گستاخیوں پر اتر آیا جب آیت کریمہ ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر خاندانِ قریش کو آواز دینا شروع کی...... اے بنی فہر! اے بنی عدی! ...... یہاں تک کہ سب کے سب اکٹھے ہو گئے۔ حتی کہ اگر کوئی آدمی خود نہیں جا سکتا تھا تو اس نے اپنا قاصد بھیج دیا کہ دیکھیے معاملہ کیا ہے؟ غرض سارے قریش آ گئے۔ ابولہب بھی آ گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ یہ بتاؤ! اگر میں یہ خبر دوں کہ ادھر وادی میں شہسواروں کی ایک جماعت ہے جو تم پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ لوگوں نے کہا: بے شک ہم نے آپ ﷺ کو ہمیشہ سچا ہی پایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا تو میں تمھیں ایک سخت عذاب سے

آگاہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ (جو دشمن کے حملے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے) اس پر ابولہب نے کہا: تو غارت ہو۔ کیا تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا؟ اس پر سورۃ ﴿ تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ﴾ نازل ہوئی کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ غارت ہوں اور وہ خود بھی غارت ہو۔[1]

درحقیقت نبی ﷺ کے بارے میں ابولہب کا موقف روز اول ہی سے، جبکہ ابھی قریش نے اس طرح کی کوئی مخالفانہ بات سوچی بھی نہ تھی، یہی رہا۔ بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس نے کوہ صفا پر نبی ﷺ کو مارنے کے لیے ایک پتھر بھی اٹھالیا تھا۔ اسی طرح جب نبی ﷺ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا انتقال ہوا تو ابولہب اس قدر خوش ہوا کہ وہ دوڑتا ہوا اپنے رفقاء کے پاس پہنچا اور انھیں یہ خبر سنائی کہ محمد ﷺ ابتر (نسل بریدہ) ہوگئے۔[2] ایام حج میں بھی ابولہب آپ ﷺ کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدبخت آپ ﷺ کی تکذیب ہی پر بس نہیں کرتا تھا بلکہ پتھر بھی مارتا تھا جس سے آپ ﷺ کی مبارک ایڑیاں خون سے رنگین ہو جاتی تھیں۔[3] قرآن مجید میں اس ناہنجار کے حالت کفر میں مرنے کی پیشین گوئی کی گئی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی اور وہ انتہائی ذلت کی موت مرا۔ اس کا اس طرح کے انجام سے دوچار ہونا نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4770، وصحیح مسلم، حدیث: 208.

[2] تفسیر ابن کثیر، سورۃ الکوثر: 4/595. [3] کنز العمال: 12/449.

34

ظلم وستم کی دستاویز کیڑوں کی غذا بن گئی

جب قریش کی ریشہ دوانیاں بہت بڑھ گئیں اوران کا رویہ نہایت جارحانہ ہوگیا توان سنگین حالات میں ابوطالب نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنے جد امجد عبد مناف کے دو صاحبزادوں ہاشم اور مطلب کے ذریعے وجود میں آنے والے دونوں خاندانوں کو جمع کیا۔ اور کہا: میں آج تک اکیلا اپنے بھتیجے کی حفاظت اور دفاع کرتا رہا۔ اب تم سب مل کر یہ فریضہ انجام دو۔ عربی حمیت اور غیرت کا تقاضا یہی تھا۔ ان دونوں خاندانوں کے سبھی کافر اور مسلمان افراد نے ابوطالب کی تجویز قبول کر لی۔ صرف بد بخت ابولہب ہی ایسا شخص تھا جو سارے خاندان سے الگ ہو کر مشرکین سے جا ملا اوران کا ساتھ دیا۔

ادھر قریش بھی غافل نہ تھے۔ انہیں ابوطالب کی تدابیر اور حضرت محمد ﷺ کی حفاظت کے لیے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے اکٹھے ہونے کی متواتر اطلاعات مل رہی

تھیں۔اب ان کے لیے قتل کے منصوبہ پر عمل کرنا آسان نہ تھا۔انہوں نے ایک اور تدبیر سوچی۔ یہ ظلم وستم کی ایک ایسی تجویز تھی جواب تک کی تمام کاروائیوں سے زیادہ سنگین تھی۔ مشرکین وادی محصب میں جمع ہوئے اور طے کیا: ہم بنو ہاشم اور بنو مطلب کا سوشل بائیکاٹ کریں گے۔ ہم ان سے شادی بیاہ کریں گے نہ لین دین کریں گے۔ خرید و فروخت کریں گے نہ ان کے گھروں میں جائیں گے اور نہ ہی بات چیت کریں گے۔ان سے ہمارا یہ بائیکاٹ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ اللہ کے رسول ﷺ کو قتل کرنے کے لیے ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ یہ ظالمانہ فیصلہ باقاعدہ دستاویز کی شکل میں لکھا گیا جس میں مندرجہ بالا تمام عہد و پیمان شامل تھے۔ صلح کے تمام دروازے بند کر دیے گئے اور عہد کر لیا گیا کہ وہ بنو ہاشم کی طرف سے صلح کی کسی بھی پیشکش کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ دستاویز ایک شخص بغیض بن عامر بن ہاشم نے قلم بند کی تھی۔ اس بد بخت کا ہاتھ شل ہو گیا۔اس عہد و پیمان کے بعد اس دستاویز کو کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا اور ابولہب کے سوا بنو ہاشم اور بنو مطلب کے تمام لوگ شعب ابی طالب میں محبوس ہو گئے۔شعب ابی طالب شہر سے ہٹ کر مکہ کے مشرق میں جبل حراء کے قریب ایک گھاٹی ہے۔

یہ اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے ساتویں سال محرم کی چاند رات کا واقعہ ہے۔اس بائیکاٹ کے نتیجے میں حالات نہایت سنگین ہو گئے۔ غلے اور سامان خورد و نوش کی آمد بند ہو گئی کیونکہ مکے میں جو غلہ یا فروخت کا سامان آتا تھا اسے مشرکین پہلے ہی سے لپک کر خرید لیتے تھے،اس لیے محصورین کی حالت نہایت پتلی ہو گئی۔

انہیں پتے اور چمڑے کھانے پڑے۔ فاقہ کشی کا حال یہ تھا بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں اور عورتوں کی آوازیں گھاٹی کے باہر تک سنائی دیتی تھیں۔ ان کے پاس بمشکل ہی کوئی چیز پہنچ پاتی تھی، وہ بھی خفیہ طور پر پس پردہ۔ وہ لوگ حرمت والے مہینوں کے علاوہ باقی ایام میں اشیائے ضرورت کی خرید کے لیے گھاٹی سے باہر نکلتے بھی نہ تھے۔ اور انھی قافلوں کا سامان خرید سکتے تھے جو باہر سے مکہ آتے تھے۔ لیکن ان کے سامان کے دام بھی مکے والے اس قدر بڑھا چڑھا کر خریدنے کے لیے تیار ہوجاتے تھے کہ غریب محصورین کے لیے کچھ خریدنا محال ہوجاتا تھا۔

حکیم بن حزام جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھتیجا تھا، کبھی کبھی اپنی پھوپھی کے لیے گیہوں بھجوادیتا تھا۔ ایک بار ابوجہل سے سابقہ پڑ گیا۔ وہ غلہ روکنے پر اڑ گیا۔ لیکن ابوالبختری نے مداخلت کی اور حکیم کو اس کی پھوپھی کے پاس بھجوا دیا تاکہ وہ گیہوں اسے دے آئے۔

ادھر ابوطالب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برابر خطرہ لگا رہتا تھا، اس لیے جب لوگ اپنے اپنے بستروں پر جاتے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے: تم اپنے بستر پر سو جاؤ۔ اُن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی ظالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت رکھتا ہو تو دیکھ لے کہ آپ کہاں سو رہے ہیں، پھر جب سب لوگ سو جاتے تو ابوطالب اُٹھتے اور آپ کی جگہ بدل دیتے تھے، یعنی اپنے بیٹوں، بھائیوں یا بھتیجوں میں سے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سلا دیتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اب تم اس کے بستر پر چلے جاؤ۔

ان حالات پر پورے تین سال بیت گئے۔ اس کے بعد محرم 10 نبوی میں صحیفہ چاک کیے جانے اور اس ظالمانہ عہد و پیمان کے خاتمے کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شروع ہی سے قریش کے کچھ لوگ اس عہد و پیمان سے راضی تھے تو کچھ ناراض بھی تھے۔ اور انہی ناراض لوگوں نے اس صحیفے کو چاک کرنے کی تگ ودو کی۔

اس کے خاتمہ کا اصل محرک قبیلہ بنو عامر بن لوئ کا ہشام بن عمرو نامی ایک شخص تھا۔ یہ رات کی تاریکی میں چپکے چپکے شعب ابی طالب کے اندر غلہ بھیج کر بنو ہاشم کی مدد بھی کرتا تھا۔ یہ زہیر بن ابی امیہ مخزومی کے پاس پہنچا۔ زہیر کی ماں عاتکہ، عبدالمطلب کی صاحبزادی، یعنی ابو طالب کی بہن تھیں۔ اس نے زہیر سے کہا: کیا تمہیں یہ گوارا ہے کہ تم تو مزے سے کھاؤ، پیو اور تمہارے ماموں کا وہ قابل رحم حال ہے جسے تم خوب جانتے ہو؟ زہیر نے کہا: افسوس! میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ ہاں اگر میرے ساتھ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں اس صحیفے کو پھاڑنے کے لیے یقیناً چل پڑتا۔ اس نے کہا: اچھا تو ایک آدمی اور موجود ہے۔ پوچھا: کون ہے؟ کہا: میں ہوں۔ زہیر نے کہا: اچھا تو اب تیسرا آدمی تلاش کرو۔

اس پر ہشام، مُطعم بن عدی کے پاس گیا۔ اور بنو ہاشم اور بنو مطلب سے جو عبدمناف کی اولاد تھے، مطعم کے قریبی نسبی تعلق کا ذکر کر کے اسے ملامت کی اور کہا کہ تم نے اس ظلم پر قریش کی ہمنوائی کیوں کی؟ یاد رہے کہ مطعم بھی عبد مناف ہی کی نسل سے تھا۔ مطعم نے کہا: افسوس! میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ ہشام نے کہا: ایک

آدمی اور موجود ہے۔ مطعم نے پوچھا: کون ہے؟ ہشام نے کہا: میں۔ مطعم نے کہا: اچھا اب تیسرا آدمی تلاش کرو۔ ہشام نے کہا: تلاش کر چکا ہوں۔ پوچھا: وہ کون ہے؟ کہا: زہیر بن ابی امیہ، مطعم نے کہا: اچھا تو اب چوتھا آدمی تلاش کرو۔ یہ سن کر ہشام بن عمرو، ابوالبختری بن ہشام کے پاس گیا۔ اس سے بھی اسی طرح کی گفتگو کی جیسی مطعم سے کی تھی۔ اس نے کہا: بھلا کوئی اس کی تائید بھی کرنے والا ہے؟ ہشام نے کہا: ہاں۔ پوچھا: کون؟ کہا: زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی۔ اور میں۔ اس نے کہا: اچھا تو اب پانچواں آدمی ڈھونڈو...... اس کے لیے ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد کے پاس گیا۔ اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے بنو ہاشم کی قرابت اور ان کے حقوق یاد دلائے۔ اس نے پوچھا: تم جس کام کے لیے مجھے بلا رہے ہو اس سے کوئی اور بھی متفق ہے؟ ہشام نے اثبات میں جواب دیا اور سب کے نام بتلائے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے حجون کے پاس جمع ہو کر آپس میں یہ عہد و پیمان کیا کہ ہم صحیفہ چاک کر دیں گے۔ زہیر نے کہا: میں ابتدا کروں گا، یعنی سب سے پہلے میں ہی زبان کھولوں گا۔

اُس وقت ابوجہل مسجد حرام کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا وہ بولا: تم غلط کہتے ہو۔ اللہ کی قسم! اسے پھاڑا نہیں جا سکتا۔

اس پر زمعہ بن اسود نے ابوجہل سے کہا: واللہ! تم بالکل غلط کہتے ہو۔ جب یہ صحیفہ لکھا گیا تھا تب بھی ہم اس پر راضی نہ تھے۔

اس پر ابوالبختری نے گرہ لگائی: زمعہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا

ہے اس سے نہ ہم راضی ہیں نہ اسے ماننے کو تیار ہیں۔ اس کے بعد مطعم بن عدی نے کہا: تم دونوں ٹھیک کہتے ہو۔ اور جو اس کے خلاف کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ ہم اس صحیفے سے اور اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس سے اللہ کے حضور براءت کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر ہشام بن عمرو نے بھی اسی طرح کی بات کہی۔

یہ ماجرا دیکھ کر ابوجہل نے کہا: ہونہہ! یہ بات رات ہی کو طے کی گئی ہے۔ اور اس کا مشورہ یہاں کے بجائے کہیں اور کیا گیا ہے۔

اس دوران ابو طالب بھی حرم پاک کے ایک گوشے میں موجود تھے۔ ان کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس صحیفے کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے کیڑے لگا دیے ہیں۔ جو ظلم وستم اور قرابت شکنی کی ساری باتیں چٹ کر گئے ہیں۔ اور صرف اللہ عزوجل کا ذکر باقی چھوڑا ہے، نبی ﷺ نے اپنے چچا کو یہ بات بتائی تو وہ قریش سے یہ کہنے آئے تھے کہ ان کے بھتیجے نے انہیں اس صحیفے کے عہد و پیمان چٹ ہو جانے کی خبر دی ہے اگر وہ جھوٹا ثابت ہوا تو ہم تمہارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں گے، پھر تمہارا جو جی چاہے کرنا۔ لیکن اگر وہ سچا ثابت ہوا تو تمہیں ہمارے بائیکاٹ اور ظلم سے باز آنا ہوگا۔ اس پر قریش نے کہا: آپ انصاف کی بات کہہ رہے ہیں۔

ادھر ابوجہل اور باقی لوگوں کی نوک جھونک ختم ہوئی تو مطعم بن عدی صحیفہ چاک کرنے کے لیے اٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ واقعی کیڑوں نے اس کا صفایا کر دیا ہے۔

صرف بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ باقی رہ گیا ہے۔ اور جہاں جہاں اللہ کا نام درج تھا صرف وہی جگہ محفوظ ہے۔ کیڑوں نے اسے نہیں کھایا تھا۔ باقی سارا صحیفہ کیڑے ہڑپ کر گئے ہیں۔

اس کے بعد صحیفہ چاک کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ اور بقیہ تمام حضرات شعب ابی طالب سے نکل آئے۔ یوں مشرکین نے آپ ﷺ کی نبوت کی ایک عظیم الشان نشانی دیکھ لی۔ اور یہ ظالمانہ اور سنگدلانہ سوشل بائیکاٹ اپنے انجام کو پہنچ گیا[1]

---

[1] زاد المعاد: 46/2، وسیدنا محمد رسول اللہ ﷺ الأسوۃ الحسنۃ: 192/1، والرحیق المختوم: 157-161.

35

سردار کے ہاتھوں سردار کی آزادی

ابی بن خلف کا بھائی امیہ بن خلف حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آقا تھا۔ وہ اسلام لانے کی پاداش میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر انتہائی بہیمانہ مظالم ڈھایا کرتا تھا۔ گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتا مگر وہ اس کی بات ماننے کی بجائے ''احد احد'' پکارتے رہتے۔ ایک مرتبہ ورقہ بن نوفل وہاں سے گزرے۔ بلال پر ہونے والا ظلم دیکھ کر کہنے لگے: میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو میں انتہائی دردناک آواز سے اس کے مظلومانہ قتل کا چرچا کروں گا۔ حضرت بلال کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جاتا تو فرماتے کہ میری زبان پر کُفر کے الفاظ کبھی نہیں آ سکتے۔ جب ظلم کی انتہا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے بندے پر رحم آ گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ظلم کا صدمہ

برداشت نہ کر سکے۔ امیہ سے کہا کہ اس مسکین کے بارے میں اپنے رب سے ڈرو۔ اس پر کیوں اتنا ظلم کرتے ہو؟ آخر کب تک یہ مشق ستم جاری رکھو گے؟ اس کے منہ سے نکل گیا: اگر اس سے اتنی ہی محبت ہے تو اسے بچا لو۔ جیسے ہی امیہ نے اشارہ دیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خریدنے کے لیے فورا تیار ہو گئے۔ پانچ اوقیہ سونے کے عوض سودا کر لیا۔ امیہ کہنے لگا تم نے تو بڑی قیمت لگا دی۔ میں تو اسے ایک اوقیہ میں بھی بیچنے پر تیار تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم اگر تم بلال رضی اللہ عنہ کی دس اوقیہ بھی قیمت لگاتے تو میں انہیں خرید کر آزاد کر دیتا۔ (یاد رہے کہ اوقیہ کا وزن آج کے اعشاری نظام میں 31 گرام کے برابر ہوتا ہے) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ (أَبُوبَكْرٍ سَيِّدُنَا وَأَعْتَقَ سَيِّدَنَا) ''ہمارے سردار ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمارے سردار بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کرایا۔''[1]

---

[1] الطبقات الکبرٰی لابن سعد: 3/233,232، والکامل في التاریخ: 1/589.

36

رحمت عالم نے پھر بھی بد دعا نہ کی

صحیح بخاری میں روایت ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ پر احد کے دن سے زیادہ بھی کوئی سخت اور سنگین دن گزرا ہے؟۔ ارشاد ہوا: ہاں تمھاری قوم کے ہاتھوں مجھے جن مصائب کا شکار ہونا پڑا ان میں سب سے مشکل اور سنگین دن وہ تھا جب میں اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے طائف گیا تھا......۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینے کے لیے قبیلہ بنو ثقیف کے تین با اثر سرداروں کا انتخاب کیا۔ ان کے ہاں قبیلہ بنو جمح کی ایک قریشی عورت بھی بیاہ کر گئی ہوئی تھی۔ یہ تینوں سردار عمرو بن عمیر ثقفی کے بیٹے عَبد یا لِیل، مسعود اور حبیب تھے۔ یہ بنو ثقیف کے رئیس اور سربراہ تھے۔ جب ان کو عقیدۂ توحید کی

دعوت دی گئی تو ان کے جوابات ایک سے ایک بڑھ کر کرخت اور بے ہودہ تھے۔ عبد یالیل کہنے لگا: اگر اللہ نے واقعی تمھیں رسول بنایا ہے تو میں کعبے کا غلاف پھاڑ دوں گا، مسعود بولا: کیا اللہ کو تمھارے علاوہ اور کوئی نہیں ملا جسے نبوت عطا کی جاتی۔ اور حبیب کہنے لگا: میں ان سے ہرگز بات نہیں کرنا چاہتا۔ اگر واقعی یہ نبی ہیں تو ان کے خلاف زبان ہلانا بے ادبی ہے۔ اور ان کی بات رد کرنا میرے لیے انتہائی خطرناک ہے اور اگر انھوں نے اللہ پر جھوٹ گھڑ رکھا ہے تو اس صورت میں بھی مجھے ان سے بات نہیں کرنی چاہیے۔

یہ نامعقول گفتگو سن کر آپ ﷺ یقیناً رنجیدہ ہوئے۔ ان سے فرمایا: ٹھیک ہے تم نے میری بات نہیں مانی مگر یہ گفتگو اپنے تک ہی محدود رکھنا، اس کا چرچا نہ کرنا۔ آپ ﷺ کا خیال تھا کہ یہ خبر قریش تک نہ پہنچے تاکہ وہ اپنی سختی میں مزید اضافہ نہ کر دیں۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر وہ شریف لوگ نہیں تھے۔ ابن ہشام کے مطابق انھوں نے نہایت گھٹیا طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔ نہ صرف علاقے میں منادی کرا دی بلکہ شہر کے تمام اوباشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔

آپ ﷺ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا۔ آپ کے آزاد کردہ محبوب غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی آپ کے شریک سفر تھے۔ آپ ﷺ نے واپسی کا ارادہ فرمایا تو سرداروں کی شہ پر طائف کے اوباش پیچھے لگ گئے۔ وہ گالیاں دے رہے تھے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آپ ﷺ کے دونوں جانب ہجوم ہو گیا۔ گالیوں اور بدزبانیوں کے

ساتھ ساتھ اب پتھراؤ بھی ہونے لگا۔ جس سے آپ ﷺ کی ایڑی پر اتنے زخم آئے کہ دونوں جوتے خون سے رنگین ہو گئے۔ حضرت زید بن حارثہ اپنی جان پر کھیل کر آپ ﷺ کو پتھروں سے بچاتے رہے۔ ان کا سر بھی زخمی ہو گیا۔ آپ ﷺ نے طائف سے تین میل کے فاصلے پر ایک باغ میں پناہ لی۔ کافروں کے اس وحشیانہ سلوک کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ کی اپنی امت سے محبت ملاحظہ کیجیے کہ وہ سخت رنجیدہ حالت میں تھے، سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بادل کا ٹکڑا سایہ فگن نظر آیا۔ اسی وقت جبرائیل آ پہنچے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کی قوم کے کرخت جوابات سن لیے ہیں۔ اس نے پہاڑوں کا نگران فرشتہ بھیجا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہ ان دو بڑے پہاڑوں کو ملا کر برابر کر دے اور اس قوم کو پیس دیا جائے۔ ارشاد ہوا: مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسی اولاد پیدا کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے گی......[1] کیا کبھی چشم فلک نے اتنے ظالمانہ سلوک کے جواب میں اِس قدر رحیمانہ برتاؤ کرنے والا مشفق اور حلیم قائد دیکھا یا سنا ہے؟ صلَّى اللهُ علَيهِ وآلهِ وسلَّم أبدًا أبدًا كثيرًا كثيرًا إلى يومِ الدِّين!

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3231، وفتح الباري: 380,379/6، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/32-34.

37

ایک جنتی اور دو جہنمی

قریش مکہ کے ایک بڑے زمیندار و وڈیرے ربیعہ کی زمینداری طائف میں تھی۔ انگوروں کا یہ باغ جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے پناہ لی تھی، اس کی ملکیت تھا۔ اس کے دونوں بیٹے شیبہ اور عتبہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ مخالفت اپنی جگہ مگر بہر حال رشتہ داری تو تھی ہی۔ انھوں نے اوباشوں کے چنگل سے نکلنے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کو لہولہان دیکھا تو ترس آ گیا۔ انھوں نے اپنے عیسائی غلام عداس کو بلایا اور کہا کہ ایک طشت میں انگوروں کا ایک گچھا رکھو اور اس شخص کو دے آؤ۔ جب اس نے انگور پیش کیے تو آپ نے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی بسم اللہ کہا۔ اس نے کہا: یہ جملہ، یعنی بسم اللہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں بولتے۔ مجھے اس کی حقیقت بتائیے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ تمھارا مذہب کیا ہے اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ وہ بولا: میں نینوا کا باشندہ اور عیسائی ہوں۔ ارشاد فرمایا: وہی

نینوا جہاں ایک صالح مرد یونس بن متی پیدا ہوئے تھے۔ عداس کہنے لگا: آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟۔ فرمایا کہ یونس نبی میرے بھائی تھے۔ میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ آپ کی زبان سے یہ کلمہ ابھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ عداس نے سر سے پاؤں تک آپ کے روئیں روئیں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ اسی دوران اسے جہنم سے آزادی کا پروانہ مل گیا۔ واپس ہوا تو اس کے سینے میں نور توحید کی شمع روشن ہو چکی تھی۔ شیبہ بن ربیعہ بڑے غور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ برداشت نہ کر سکا۔ عداس واپس ہوا تو کہنے لگا: اے بدنصیب! تم اس شخص کے ساتھ کس غضب کی عقیدت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کہیں اس کا مذہب قبول نہ کر لینا۔ سنو! تمھارا مذہب اس کے مذہب سے کہیں اعلیٰ اور افضل ہے۔ عداس کہنے لگا: اس شخص سے بہتر روئے زمین پر اور کوئی نہیں۔ اس نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں وہ نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔[1]

جنگ بدر میں کفار مکہ کے ساتھ ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ بھی نکلے۔ ان کے ساتھ عتبہ کا بیٹا ولید بھی تھا۔ ان کا یہی غلام عداس مکہ سے باہر ثقفیہ البیضاء کے ٹیلے پر بیٹھا تھا۔ اس نے انہیں روکا اور کہا کہ یہ شخص واقعی اللہ کا رسول ہے۔ آپ لوگوں کا بدر کو جانا گویا مقتل میں جانا ہے۔ مگر ان پر جاہلی عصبیت کا بھوت سوار تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے بدر جانے والے لشکر کو کھانا بھی مہیا کیا تھا۔ پہلے شیبہ نے نو اونٹ اور پھر عتبہ نے دس اونٹ ذبح کیے۔ ان بدبختوں کو موت بدر میں گھیر کر لا

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 35،34/2، دیکھیے الرحیق المختوم، ص: 187.

رہی تھی۔ دنیا داری کے امور میں یہ لوگ نہایت سمجھدار تھے۔ مگر ان کے مقدر میں نجس موت اور بدر کا اندھا کنواں لکھا جا چکا تھا۔[1] واضح رہے کہ عتبہ کا ایک بیٹا ابوحذیفہ مسلمان تھا اور بدر میں شریک تھا۔ مگر عتبہ اور شیبہ کی تقدیر نے انہیں ذلت اور ہلاکت کے حوالے کر دیا۔ عداس کے دل میں سچائی کا پرستار دل دھڑک رہا تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کو فوراً پہچان گیا اور دولت اسلام سے مالا مال ہو کر جنتی بن گیا لیکن عتبہ اور شیبہ بینائی رکھنے کے باوجود اندھے نکلے۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کو نہ پہچان سکے۔ ان کی نخوت، عداوت اور ہٹ دھرمی نے انہیں ذلت کی موت سے ہمکنار کیا اور جہنم کے سپرد کر دیا...... اللہ کے کام نرالے ہیں۔ ان کی حقیقت و مصلحت کون جانے!!

---

[1] السیرۃ الحلبیۃ: 379/2، ودلائل النبوۃ للبیہقی: 109/3، والبدایۃ والنہایۃ: 272/3.

38

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جنات کی حاضری

جب سے رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے، جنات بھی پریشان نظر آتے تھے۔ ایک صاحب ایام جاہلیت میں کاہن تھے، بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دن وہ بازار میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک جنیہ آئی، اس کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ وہ کہنے لگی: ''کیا تم نے جنات کی حیرت اور مایوسی دیکھی؟ کیا ان کی ندامت کے بعد ان کی ناامیدی دیکھی؟ اور کیا تم نے لوگوں کا اونٹ والوں اور چادر اوڑھنے والوں (اہل عرب) کا تابع ہو جانے کا منظر دیکھا؟''

رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہوتے ہی جنات اور آسمان کے درمیان رکاوٹ پیدا ہو گئی اور ان پر شدت سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ ایک دن جنات اوپر سے واپس آنے کے بعد کہنے لگے: ''یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے اور اب ہم پر شدت سے چنگاریاں برسائی جاتی ہیں۔'' ان میں سے ایک جن نے کہا: ''ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان جو

رکاوٹ ہوگئی ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) ضرور کوئی نئی بات ظہور میں آئی ہے۔" پس وہ چلے۔ اور انھوں نے زمین کے مشارق و مغارب کا چکر لگایا۔ ان سب کو اس بات کی کھوج لگی ہوئی تھی کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو ان کے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوگئی ہے؟ بالآخر جنات کی وہ جماعت جو سرزمین تہامہ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے قریب پہنچ گئی۔ آپ ﷺ اس وقت مقام نخلہ میں تھے اور سوق عکاظ کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ صبح کے وقت یہ جماعت وہاں پہنچی اس وقت رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب سمیت نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ ﷺ کی قراءت کی آواز اُن کے کان میں آئی تو انھوں نے قرآن مجید کو بڑے غور سے سنا، پھر کہنے لگے: "یہی تو وہ چیز ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوگئی ہے۔" یہاں سے واپس وہ اپنی قوم کے پاس آئے اور کہا: "اے ہماری قوم! ہم نے قرآن سنا، وہ بڑا عجیب ہے۔ وہ ہدایت کا راستہ بتاتا ہے۔ پس ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم کسی کو اپنے رب کے ساتھ شریک نہ کریں گے۔" اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع اپنے رسول ﷺ کو دی۔ فرمایا:

(اے میرے رسول!) "آپ کہہ دیجیے کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور پھر کہا: ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کا راستہ بتاتا ہے۔ ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ ہمارے رب کی عظمت بہت عالی شان ہے۔ اس کی کوئی بیوی ہے نہ اولاد، ہمارے بعض بے وقوف اللہ کے بارے میں افترا پردازی کرتے تھے اور ہم یہ خیال کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ پر جھوٹ نہیں بولتے۔

اور انسانوں میں سے بعض جنات کی پناہ پکڑتے تھے۔ اس سے جنات کا غرور اور سرکشی اور زیادہ بڑھ جاتی تھی اور انسانوں کا بھی یہی اعتقاد تھا جیسا کہ (اے جنات) تمھارا اعتقاد تھا کہ اللہ کسی کو مبعوث نہیں کرے گا۔ اور ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے مضبوط چوکیداروں اور سخت شعلوں سے بھرا ہوا پایا اور ہم آسمان میں خبریں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب کوئی سننا چاہتا ہے تو وہ اپنے لیے تیز شعلے پاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اہل زمین کے ساتھ برائی مقصود ہے یا بھلائی۔ ہم میں سے بعض نیک ہیں اور بعض اور طرح کے ہیں۔ ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں اور ہم نے یقین کر لیا کہ ہم زمین میں اللہ کو ہرگز نہیں ہرا سکتے، نہ بھاگ کر اسے تھکا سکتے ہیں۔ ہم نے ہدایت کی کتاب سنی۔ ہم اس پر ایمان لائے (اور) جو شخص بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے اسے نہ کسی نقصان کا خوف ہے اور نہ ظلم کا۔ ہم میں بعض مسلم ہیں اور بعض نافرمان، جو مسلم ہیں وہ سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور جو نافرمان ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہیں۔ [1]

جنات ایک مرتبہ قرآن مجید سن کر چلے گئے۔ دوسری مرتبہ پھر آئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جنات کی آمد کی خبر مل گئی۔ اتنے میں جنات کی طرف سے ایک بلانے والا بھی آ گیا۔ رات کا وقت تھا، آپ ﷺ اس کے ساتھ چلے گئے۔ صحابہ کو خبر نہ ہوئی۔ وہ بہت پریشان ہوئے کہ آپ ﷺ کہاں چلے گئے۔ رات بھر تلاش کرتے رہے۔ صبح کے وقت آپ ﷺ حراء سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں جنات کے پاس گیا تھا۔ انھیں قرآن سنایا، پھر

[1] (الجن 72:1-15) صحیح البخاري، حدیث: 773، وصحیح مسلم، حدیث: 449.

آپ ﷺ صحابہ کو بھی وہاں لے گئے اور انھیں جنات کے نقوش اقدام اور آگ جلانے کے مقامات دکھائے۔اس واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات نازل فرمائیں۔فرمایا:اے میرے رسول!

﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾

’’اور جب ہم نے کچھ جنات کو آپ ﷺ کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ قرآن سنیں۔ وہ آئے اور کہنے لگے خاموش رہو۔ واپس جا کر انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا۔ انھوں نے کہا اے قوم! ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل ہوئی ہے وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور حق اور صراط مستقیم کی ہدایت کرتی ہے۔ اے قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو اور ایمان لے آؤ۔ تمھارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ عذاب سے بچ جاؤ گے اور جو شخص دعوت الی اللہ کو قبول نہیں کرے گا، وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔ اس کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔‘‘[1]

---

[1] (الأحقاف:46:29-32) صحیح مسلم، حدیث:450.

اور انسانوں میں سے بعض جنات کی پناہ پکڑ تے تھے۔ اس سے جنات کا غرور اور سرکشی اور زیادہ بڑھ جاتی تھی اور انسانوں کا بھی یہی اعتقاد تھا جیسا کہ (اے جنات) تمھارا اعتقاد تھا کہ اللہ کسی کو مبعوث نہیں کرے گا۔ اور ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے مضبوط چوکیداروں اور سخت شعلوں سے بھرا ہوا پایا اور ہم آسمان میں خبریں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب کوئی سننا چاہتا ہے تو وہ اپنے لیے تیز شعلے پاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اہل زمین کے ساتھ برائی مقصود ہے یا بھلائی۔ ہم میں سے بعض نیک ہیں اور بعض اور طرح کے ہیں۔ ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں اور ہم نے یقین کر لیا کہ ہم زمین میں اللہ کو ہرگز نہیں ہرا سکتے، نہ بھاگ کر اسے تھکا سکتے ہیں۔ ہم نے ہدایت کی کتاب سنی۔ ہم اس پر ایمان لائے (اور) جو شخص بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے اسے نہ کسی نقصان کا خوف ہے اور نہ ظلم کا۔ ہم میں بعض مسلم ہیں اور بعض نافرمان، جو مسلم ہیں وہ سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور جو نافرمان ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہیں۔[1]

جنات ایک مرتبہ قرآن مجید سن کر چلے گئے۔ دوسری مرتبہ پھر آئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جنات کی آمد کی خبر مل گئی۔ اتنے میں جنات کی طرف سے ایک بلانے والا بھی آ گیا۔ رات کا وقت تھا، آپ ﷺ اس کے ساتھ چلے گئے۔ صحابہ کو خبر نہ ہوئی۔ وہ بہت پریشان ہوئے کہ آپ ﷺ کہاں چلے گئے۔ رات بھر تلاش کرتے رہے۔ صبح کے وقت آپ ﷺ حراء سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں جنات کے پاس گیا تھا۔ انھیں قرآن سنایا، پھر

---

[1] (الجن 72:1-15) صحیح البخاري، حدیث: 773، وصحیح مسلم، حدیث: 449.

آپ ﷺ صحابہ کو بھی وہاں لے گئے اور انھیں جنات کے نقوش اقدام اور آگ جلانے کے مقامات دکھائے۔اس واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات نازل فرمائیں۔فرمایا:اے میرے رسول!

﴿ وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوٓا أَنصِتُوا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ﴿٢٩﴾ قَالُوا يَا قَوْمَنَآ إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيٓ إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٣٠﴾ يَا قَوْمَنَآ أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣١﴾ وَمَن لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَآءُ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾

''اور جب ہم نے کچھ جنات کو آپ ﷺ کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ قرآن سنیں۔ وہ آئے اور کہنے لگے خاموش رہو۔ واپس جا کر انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا۔ انھوں نے کہا اے قوم! ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل ہوئی ہے وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور حق اور صراط مستقیم کی ہدایت کرتی ہے۔اے قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو اور ایمان لے آؤ۔تمھارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ عذاب سے بچ جاؤ گے اور جو شخص دعوت الی اللہ کو قبول نہیں کرے گا، وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔اس کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔''[1]

---

[1] (الأحقاف:46:29-32) صحیح مسلم،حدیث:450.

کسریٰ کے کنگن ایک بدو کی بانہوں میں

دو اونٹنیوں کا قافلہ تیزی سے یثرب کی طرف رواں دواں تھا۔ اب یہ بنی مُدلج کے علاقے قُدید سے گزر رہا تھا۔ ان اونٹنیوں پر چار افراد سوار تھے۔ ان میں ایک بزرگ جس کی داڑھی کے کچھ بال سفید ہو چکے تھے بڑی بے تابی سے کبھی آگے کبھی پیچھے دیکھ رہے تھے۔ گویا کسی بھی خطرے کو بھانپ کر اس کا مقابلہ کرنے کی دُھن میں تھے۔ یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس قافلے کے سربراہ امام الانبیاء کائنات کے امام سید البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ادھر بنو مُدلج کا سردار سراقہ بن مالک اپنے گھر میں اپنے حواریوں سمیت بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ اچانک ایک شخص اندر داخل ہوا۔ کہنے لگا: سراقہ! میرا خیال ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اپنے ساتھیوں سمیت ساحل سمندر سے گزر رہے ہیں۔ میں ابھی ابھی انھیں دیکھ کر آ رہا ہوں سراقہ سمجھ گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ ان دنوں مکہ کے ارد گرد تمام قبائل اور

بستیوں میں ایک ہی موضوع زیر بحث تھا کہ اس قافلے کو کس طرح روکا جائے اور انھیں زندہ یا مردہ (معاذ اللہ) قریش مکہ کے حوالے کیا جائے۔ اس مذموم کارروائی کے لیے سو سرخ اونٹوں کا انعام مقرر تھا۔ اور یہ اتنا بڑا انعام تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر شخص بے قرار تھا۔

سراقہ نے پہلو بدلا، اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا کہ یہ انعام مجھے ملنا چاہیے۔ آخر میں اس قبیلہ کا سردار ہوں۔ اور یہ قافلہ میرے ہی علاقے سے گزر رہا ہے۔ میں اس پر قابو پا سکتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص میرے ساتھ اس قافلے پر قابو پانے میں شریک ہوتا ہے تو انعام تقسیم ہوسکتا ہے۔ اس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر اس شخص کو گھورتے ہوئے کہا: تمھارا اندازہ بالکل غلط ہے۔ بھلا محمد (ﷺ) یہاں سے کہاں گزر سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں بلکہ تم نے کسی اور کو دیکھا ہے جو تمہاری نظروں کے سامنے گزرے ہیں۔ قافلہ کی خبر دینے والا شخص اب خجالت محسوس کر رہا تھا۔ ادھر سراقہ نے اپنی لونڈی کو طلب کیا اور اس کے کان میں کہا: فوراً میرے گھوڑے پر زین کسو اور اسے تیار کر کے فلاں جگہ کھڑی ہو جاؤ۔ خبردار! کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ ہاں جلدی جلدی کرنا، تاخیر ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ پھر وہ اہلِ مجلس کے ساتھ کسی اور موضوع پر گفتگو کرنے لگا۔

اس کا ذہن مسلسل قافلے کے تعاقب میں تھا۔ جب اندازہ ہو گیا کہ اس کی لونڈی گھوڑا تیار کر کے مقررہ مقام پر پہنچ چکی ہوگی۔ تو اس نے اہل مجلس سے گھر

میں ضروری کام کا بہانہ کیا اور اپنے گھر کے پچھواڑے سے باہر نکل گیا۔ اس نے نیزہ سنبھالا، گھوڑے پر سوار ہو کر اسے قافلہ کی طرف دوڑایا۔ گھوڑا پوری قوت سے سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اچانک گھوڑا پھسلا اور سراقہ نیچے گر پڑا۔

اس نے اٹھ کر ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پانسے کے تیر نکالے اور یہ جاننا چاہا کہ میں انھیں ضرر پہنچا سکوں گا یا نہیں؟۔ اتفاق کی بات کہ تیر وہ نکلا جو اسے ناپسند تھا۔ فال بتا رہی تھی کہ قافلے کا پیچھا کرنا مناسب نہیں مگر سو اونٹوں کا لالچ اُسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور قافلے کے بہت قریب جا پہنچا۔ حتی کہ اس کے کانوں میں اللہ کے رسول ﷺ کی قراءت کی آواز آنے لگی۔ ادھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے بے چین نظر آرہے تھے۔ انھوں نے سراقہ کو قریب آتے دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے: اللہ کے رسول ﷺ! یہ پیچھا کرنے والا اب ہمیں پکڑنے ہی والا ہے۔ ادھر عزیمت کے پہاڑ، اپنے رب پر مکمل بھروسہ کرنے والے پیغمبر ﷺ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ابوبکر! (لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا) ''میرے یارِ غار! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

سراقہ کا گھوڑا مسلسل دوڑ رہا تھا۔ بتدریج قریب ہو رہا تھا۔ ابوبکر صدیق پریشانی کے عالم میں بے اختیار رو پڑے۔ ارشاد ہوا: ابوبکر! کیوں رو رہے ہو؟۔ عرض کیا: میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! میں اپنی جان کے خوف سے نہیں بلکہ آپ کی خاطر رو رہا ہوں۔

رسالت مآب ﷺ کے ہاتھ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: (اَللّٰهُمَّ اكْفِنَاهُ بِمَا شِئْتَ) "اے اللہ تو جیسے چاہے اس سے ہمیں بچا لے۔"

ادھر زبان اقدس سے یہ الفاظ نکلے ادھر سراقہ کا گھوڑا دوبارہ لڑکھڑا کر گر پڑا اور اس مرتبہ اس کے اگلے دونوں پاؤں گھٹنوں سمیت سخت زمین میں دھنس گئے۔ اب سراقہ نے دوبارہ پانسے کے تیر سے فال نکالی۔ وہی تیر نکلا جو اسے ناپسند تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس قافلے کا پیچھا کرنا سراسر غلط کام ہے۔ جو بھی ان کا پیچھا کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ محمد (ﷺ) غالب آ کر رہیں گے۔ اس نے قافلے والوں کو پکارا اور کہا: اے محمد (ﷺ)! میں جان چکا ہوں کہ آپ (ﷺ) کی مخالفت کے باعث میرا گھوڑا زمین میں دھنس گیا ہے۔ اللہ سے دعا فرمائیے، وہ مجھے نجات دے میں نہ صرف خود آپ (ﷺ) کا تعاقب چھوڑ دوں گا بلکہ اس طرف آنے والوں کو بھی لوٹا دوں گا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے دعا فرمائی تو زمین نے اسے چھوڑ دیا۔ سراقہ نے عرض کیا: (أَتَكْتُبُ لِي كِتَاباً يَكُونُ آيَةً بَيْنِي وَ بَيْنَكَ) "میرے لیے پروانہ امن لکھ دیجیے جو میرے اور آپ کے درمیان بطور نشانی رہے گا۔" آپ ﷺ نے ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیا کہ اسے امان لکھ دو۔ انھوں نے چمڑے کے ٹکڑے پر امان نامہ لکھ دیا۔ سراقہ نے آپ ﷺ کو قریش کے عزائم اور سو اونٹوں کے انعام کے بارے میں آگاہ کیا اور آپ کو زاد سفر اور ساز و سامان کی پیش کش کی۔

مگر آپ نے کسی بھی قسم کا سامان لینے سے انکار کر دیا۔ صرف یہ فرمایا: ہمارے بارے میں راز داری سے کام لینا۔[1]

سراقہ وہاں سے جانے لگا تو اچانک اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا: (كَيْفَ بِكَ إِذَا لَبِسْتَ سِوَارَيْ كِسْرٰى وَ مَنْطِقَتَهُ وَ تَاجَهُ) "سراقہ! تمھیں کیسا لگے گا، جب تم کسریٰ بن ہرمز کے دونوں کنگن، پیٹی اور اس کا تاج پہنو گے۔" سراقہ نے یہ بات بڑے تعجب سے سنی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کہاں کسری بن ہرمز اور اس کے کنگن اور کہاں میں![2] ...... اس کے بعد قافلہ یثرب کی طرف بڑھ گیا۔ سراقہ واپس آیا تو دیکھا کہ لوگ قافلہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سراقہ کہنے لگا: ادھر کی کھوج خبر تو میں دُور دُور تک کر چکا ہوں۔ تمھیں اس طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمھارے حصے کا کام کر چکا ہوں۔ اور پھر جب اللہ کے رسول ﷺ بحفاظت مدینہ منورہ پہنچ گئے تو سراقہ نے لوگوں کو یہ واقعہ سُنایا۔ سراقہ نے امان نامہ سنبھال کر رکھا۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ مکہ فتح ہوا۔ آپ ﷺ حنین اور طائف سے فتح یاب ہو کر جعرانہ کے مقام پر قیام فرما ہوئے۔

بنی مُدلج کا یہ سردار یہی امان نامہ لیے اللہ کے رسول ﷺ سے ملنے آیا۔ بدو آدمی تھا۔ تمام رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ انصار کے ایک گھوڑسوار دستے نے اسے روکا کہ (إِلَيْكَ، إِلَيْكَ مَاذَا تُرِيدُ) "ارے!

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3906، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/102،103.

[2] أسد الغابة: 2/414.

کہاں منہ اُٹھائے جا رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟۔'' اس نے جواب میں وہی پروانہ جیب سے نکالا اور اسے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف بڑھایا۔ آپ ﷺ اس وقت اونٹنی پر سوار تھے ۔ عرض کرنے لگا :یا رسول اللہ! (هَذَا كِتَابُكَ لِي وَأَنَا سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكٍ) ''یہ آپ ﷺ ہی کا دیا ہوا امان کا پروانہ ہے۔ میں سراقہ بن مالک ہوں۔''

ارشاد ہوا: (هَذَا يَومُ وَفَاءٍ وَبِرٌّ ، أُدْنُهْ) ''آج کا دن وفا نبھانے کا دن ہے۔ نیکی اور احسان کرنے کا دن ہے، میرے قریب آ جاؤ۔ [1]

پھر چند لمحات کے بعد سراقہ بن مالک کو صحابی بننے کا شرف نصیب ہوا۔ اب وہ اسلام کا ایک سچا سپاہی تھا۔ مسلمانوں کی فتوحات تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اللہ کے رسول ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ آپ کے نامہ مبارک کو چاک کرنے والے کسریٰ کی حکومت پاش پاش ہوئی اس کا غرور خاک میں مل گیا۔ اس کے خزانوں کو توڑا گیا۔ کسریٰ بن ہرمز کا تاج اس کی پیٹی اور کنگن مدینہ منورہ بھیجے گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حکم دیا: لوگو! سراقہ بن مالک کو بلاؤ ، میرے نبی ﷺ کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ سراقہ آتے ہیں ۔ ارشاد ہوا ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ پھر آپ نے ان کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنائے اور فرمایا: اللہ اکبر! اس اللہ کا شکر ہے جس نے ان کنگنوں کو کسریٰ بن ہرمز سے چھینا، وہ کسریٰ جو کہتا تھا (أنا رب الناس) ''میں لوگوں کا

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/103، 104، فتح الباري: 7/303.

رب ہوں۔'' آج اللہ نے مسلمانوں کو یہ عزت و وقار عطا فرمایا ہے کہ بنی مدلج کے ایک بدو کو اس کے کنگنوں کا مالک بنا دیا ہے۔[1]

اس طرح نبی کریم ﷺ نے خندق کی کھدائی کے موقع پر جو پیشین گوئی فرمائی تھی کہ مجھے کسریٰ کے خزانوں کی چابیاں عطا کر دی گئی ہیں وہ بھی فتح مدائن کے موقع پر پوری ہوگئی اور آپ کے خدام کو وہ چابیاں عطا کر دی گئیں۔

[1] أسد الغابة: 2/414.

40

یہود کا تعصب اور عداوت

یہود کو علم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ تشریف لانے والے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ نبی انہی کی قوم میں سے ہوگا، اس لیے جب بشیر و نذیر تشریف لائے تو عربی النسل ہونے کی وجہ سے ان سے حسد کیا گیا۔ ان کا ایک عالم کہنے لگا: اے یہود کی جماعت! عنقریب بالکل انہی ایام میں آخری نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ اور وہ ہماری ہی سرزمین پر تشریف لائیں گے۔ یہودی پوچھنے لگے: ان کی نشانیاں کیا ہیں؟۔ جواب ملا: میانہ قد کے ہوں گے، سفید رنگ کے سرخی مائل نہایت خوبصورت، حرہ کے پہاڑوں سے داخل ہوں گے۔ وہ اُمّی ہوں گے۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہوں گے۔ ہجرت کے موقع پر یہ ساری نشانیاں روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئیں۔ مگر ہائے رے حسد کہ اس کا کوئی علاج ہی نہیں۔

ام المؤمنین سیدہ صفیہ بنتِ حُیی سے روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا: میں اپنے

والد اور چچا کی بڑی چہیتی تھی۔ وہ مجھ سے دوسری اولاد کے مقابلہ میں زیادہ پیار کرتے تھے۔ جب بھی دیکھتے فوراً گود میں اٹھا لیتے تھے۔ جب اللہ کے رسول قبا میں تشریف لائے تو میرے والد اور چچا بھی ملاقات کے لیے گئے۔ غروب آفتاب کے وقت واپس آئے تو بڑے تھکے ماندے، گرتے پڑتے لڑکھڑائی ہوئی چال چلتے نظر آئے۔ میں حسب معمول چہک کر ان کی طرف دوڑی مگر واللہ! انہیں اس قدر غم تھا کہ انھوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے چچا کو سنا وہ میرے والد حیی بن اخطب سے کہہ رہے تھے: کیا یہ وہی ہے؟۔ جواب ملا: ہاں اللہ کی قسم! چچا نے پوچھا: کیا آپ نے انہیں ٹھیک پہچانا ہے؟ والد نے کہاں ہاں۔ چچا نے کہا: تو پھر کیا ارادے ہیں؟ جواب ملا: عداوت، اللہ کی قسم! جب تک زندہ رہوں گا ان کی عداوت سے باز نہیں آؤں گا۔ [1]

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 132/2، ودلائل النبوۃ للبیہقي: 533/2، والبدایۃ والنھایۃ: 222,221/3.

41

یہودیوں کی کہہ مکرنیاں

عبداللہ بن سلام یہود کے ایک بڑے مشہور اور محترم عالم تھے۔ کہتے ہیں: میں نے نبی آخر الزماں ﷺ کی صفات تورات میں پڑھ رکھی تھیں۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو میں فوراً خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے پاس لوگوں کا بڑا مجمع تھا۔ چہرہ انور پہ نگاہ ڈالی تو گویا وہ چودھویں رات کا چمکتا ہوا چاند تھا۔ دل نے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے کا نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کے قریب ہوا۔ آپ ارشاد فرما رہے تھے: (أَفْشُوا السَّلَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ) ”اے لوگو! سلام کو عام کرو، صلہ رحمی کرو، راتوں کو جب لوگ سو رہے ہوں نماز ادا کرو، نہایت سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔“ میں نے آپ ﷺ سے سوال کیا: آپ کون ہیں؟ فرمانے لگے: میں اللہ کا رسول ہوں۔

میں نے پوچھا: آپ کو کس نے مبعوث فرمایا ہے؟ ارشاد ہوا: اللہ نے۔ میں نے کہا: میں آپ سے قیامت کی نشانیاں پوچھنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا: جو جی چاہے، پوچھو۔ میں نے عرض کیا: تین سوال پوچھوں گا۔ پہلا سوال: قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ دوسرا: جنتی لوگ پہلا کھانا کیا تناول کریں گے؟ اور تیسرا: بچہ اپنی ماں یا باپ کے مشابہ کس بنا پر ہوتا ہے؟

ارشاد فرمایا: قیامت کی پہلی نشانی آگ ہو گی جو لوگوں کو مشرق سے دھکیلتی ہوئی مغرب کی طرف لے جائے گی۔ جنتی لوگوں کی پہلی ضیافت مچھلی کی کلیجی سے کی جائے گی۔ بچے کے ماں یا باپ کے مشابہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مرد کا پانی سفید اور گاڑھا ہوتا ہے۔ جبکہ عورت کا زرد اور پتلا۔ اگر ان میں سے ایک کا پانی دوسرے پر غالب آ جائے تو بچہ اس کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا: آپ نے درست فرمایا۔ اور پھر گواہی دی (أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ) ایک دن میں نے کہا: یا رسول اللہ! یہود ایک بہتان باز قوم ہے۔ اگر انہیں میرے اسلام لانے کا پتا چل گیا تو وہ مجھ پر بہتان تراشیں گے۔ آپ ﷺ نے یہود کو بلا بھیجا۔ عبداللہ بن سلام گھر کے اندر چھپ کر بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا کہ عبداللہ بن سلام کیسے آدمی ہیں؟ وہ بیک زبان کہنے لگے: وہ ہمارے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عالم کے بیٹے، سب سے اچھے اور سب سے اچھے کے بیٹے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے: ہمارے سردار اور ہمارے سردار کے بیٹے، افضل ترین شخص اور افضل ترین شخص کے بیٹے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اچھا اگر وہ

مسلمان ہو جائیں تو پھر؟ انھوں نے اوپر تلے دو تین بار کہا: اللہ انہیں اس سے محفوظ رکھے۔ اب عبداللہ بن سلام یہود کی یہ گفتگو سن کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے ان کے سامنے آ گئے۔

انہیں دیکھتے ہی یہود کہنے لگے: یہ ہمارا نہایت برا آدمی ہے اور سب سے برے آدمی کا بیٹا ہے۔ انہیں ان میں اور بھی طرح طرح کی برائیاں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ عبداللہ بن سلام نے کہا کہ اے جماعت یہود! اللہ سے ڈرو۔ اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تم لوگ خوب جانتے ہو کہ یہ اللہ کے سچے رسول ﷺ ہیں۔ حق لے کر تشریف لائے ہیں۔ مگر یہودیوں نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ ہم نہیں مانتے۔[1]

[1] البداية والنهاية: 3/219-221.

42

اخلاص و وفاداری کے نادر نمونے

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ میدان بدر میں مسلمانوں کے جنگی کیمپ میں اللہ کے رسول کے جھنڈے تلے ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے۔ یہ جنگ بلاشبہ ''الفرقان'' تھی، یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والی جنگ۔ جو اسلامی جھنڈے تلے کھڑا تھا، وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا تھا اور جو ابوجہل کے جھنڈے تلے تھا وہ اسلام کا، اللہ کا اور اس کے رسول کا دشمن تھا۔ ان کا والد ابوجہل کے کیمپ میں تھا۔ لڑائی شروع ہوئی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شیر کی طرح لپکے اور اپنے والد کو واصل جہنم کر دیا۔[1] قارئین کرام! ذرا غور فرمایئے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور شیفتگی کا کتنا سچا اور کھرا نمونہ پیش فرما دیا کہ

---

[1] المعجم الکبیر للطبراني: 1/154، المستدرک للحاکم: 3/265، مستدرک کے محقق عبدالسلام بن محمد علوش کہتے ہیں کہ ابوعبیدہ کے اپنے باپ کو قتل کرنے والی روایت مرسل صحیح ہے۔

خون کے رشتے کو ذرا بھی اہمیت نہ دی اور اپنے اسلام دشمن باپ کو پکے دشمن کی طرح موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے کھرے پن کا حقیقی معیار یہی ہے کہ اللہ رب العزت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت و فدویت کے مقابلے میں زندگی کے عزیز ترین رشتے بھی بلا تأمل قربان کر دیے جائیں۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پرورش آپ ﷺ کے سایۂ عاطفت میں آپ ﷺ ہی کے گھر میں ہوئی۔ انھوں نے آپ ﷺ کی صفات کو دیکھا آپ کی سیرت کو قریب سے دیکھا اور آپ ﷺ کے ایسے شیدا ہوئے اور آپ ﷺ سے اس طرح محبت کی جس طرح ایک بیٹا اپنے باپ سے محبت کرتا ہے۔ اسی محبت کا مظاہرہ تھا کہ ہجرت کی پر خطر رات مشرکین آپ ﷺ کے دروازے پر تلواریں سونتے کھڑے تھے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ذرا بھی ہراس طاری نہیں ہوا۔ وہ دشمنوں کی چمکتی ہوئی شمشیروں کے سائے میں بے دریغ اللہ کے رسول ﷺ کی سبز چادر اوڑھ کر آپ ﷺ کے بستر پر سوئے رہے۔[1]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ننھے سے انس کو اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے خادم خاص تھے۔ آپ ﷺ کے چھوٹے موٹے کام کرتے تھے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے 93 ہجری میں رحلت فرما گئے۔ ان کا تعلق قبیلۂ خزرج سے تھا۔ کنیت ابو حمزہ تھی، کثیر الاولاد تھے۔ مؤرخین کے مطابق ان کے بیٹے بیٹیوں اور پوتوں نواسوں کی تعداد ایک 100 سو سے زیادہ تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کے 78

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:2/96.

بیٹے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ نامور بصری محدث ابوعمیر عبدالکریم بن محمد انہی کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ کی صفت یوں بیان کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی۔ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا یہ عالم رہا کہ مجھے کبھی اف تک نہیں کہا۔ مارا نہ ڈانٹا، نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے فلاں کام کیوں نہیں کیا اور یہ کام کیوں کیا۔ پوری تاریخ انسانیت میں بھلا ایسا آقا کون ہوگا جو اتنے بالیدہ اخلاق کی منفرد کسوٹی پر پورا اترنے کی ہمت کر سکے گا؟ تاریخ عالم میں کہیں کسی ایک شخص کی بھی مثال ایسی نہیں جس کا اخلاق اپنے خادم کے ساتھ اتنا نادر اور یگانہ ہو۔ اور یہ ایک دو دن کی بات نہیں، پورے دس سال کی سرگزشت ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے آپ کے سراپائے اقدس کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بھی سننے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ دنیا میں ریشم اور حریر کی مثال دی جاتی ہے کہ وہ بڑی نرم اور نازک ہوتی ہے۔ انس بن مالک بتلاتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو ریشم اور حریر سے بھی زیادہ نرم و نازک پایا۔ میں نے کوئی خوشبو اللہ کے رسول کے جسم اطہر سے پھوٹنے والی مہک سے بہتر نہیں پائی۔ [1]

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و رحمت کا ایک اور نمونہ دیکھیے، زید بن حارثہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے اتنا کریمانہ برتاؤ کیا کہ وہ آپ سے اپنے ماں باپ سے بڑھ کر محبت کرنے لگے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ حارثہ بن

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3561، وصحیح مسلم، حدیث: 81,82.

شراحیل کے صاحبزادے تھے۔ قبیلہ کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ ایک موقع پر اپنے میکے گئیں، صاحبزادے کو بھی ساتھ لے گئیں۔ اس وقت زید صرف 8 سال کے تھے۔ اس موقع پر بنی قیس بن جسرہ کے لوگوں نے ان کی والدہ کے خاندان والوں اور نواحی لوگوں پر حملہ کیا۔ لوٹ مار کے دوران انھوں نے جن لوگوں کو پکڑا ان میں یہ زید بھی شامل تھے۔ یہ ظالم لوگ طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں پہنچے جہاں انھوں نے زید کو بیچ ڈالا۔ ان کے خریدار حکیم بن حزام تھے۔ وہ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے۔ انھوں نے زید کو حضرت خدیجہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کیا تو انھوں نے زید بن حارثہ کو اپنے شوہر والا گہر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت پر مامور کر دیا۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت خدیجہ اور حضرت علی جیسی ان اولین ہستیوں میں سے تھے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر سب سے پہلے بلا تأمل ایمان لے آئی تھیں۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اس غلام کو غلامی سے چھڑانے کے لیے اس کے والد حارثہ اپنے بھائی کے ساتھ مکہ آئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ ہم اپنے بیٹے کو چھڑوانے آئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جتنا معاوضہ طلب فرمائیں، ہم دینے کو تیار ہیں۔

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ زید میری طرف سے آزاد ہے۔ بس اس سے پوچھ لو اگر یہ جانا چاہتا ہے تو لے جاؤ، مجھے

کوئی اعتراض نہیں۔ اختیار تمھارے بیٹے کا ہے۔ بھلا اس سے زیادہ انصاف کی بات کیا ہو سکتی تھی؟...... اور پھر باپ اور چچا فوراً زید کے پاس گئے اور کہنے لگے: چلو تمھیں آزادی کا پروانہ مل چکا ہے، ہم تمھیں لینے آئے ہیں...... ادھر زید کا عالم ہی نرالا تھا۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو قریب سے دیکھا تھا۔ اور آپ ﷺ کے عدیم النظیر اخلاق اور شفقت و مرحمت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ انھوں نے بلا تأمل کہا کہ میں محمد (ﷺ) پر کسی کو بھی ترجیح نہیں دوں گا۔ محمد ﷺ کی غلامی پر ہزاروں آزادیاں قربان ہیں۔

یہ جواب سن کر باپ اور چچا ناراض ہو گئے، کہنے لگے: زید! تمھارا ناس ہو، تم غلامی کو آزادی پر ترجیح دے رہے ہو۔ اپنے والد اور چچا اور اپنے خاندان پر محمد ﷺ کو ترجیح دے رہے ہو۔ حضرت زید کہتے ہیں ہاں غلامی تو ہے مگر تم لوگ جانتے نہیں کہ یہ کس کی غلامی ہے؟ بلا شبہ میں نے محمد ﷺ میں جو محبت، الفت، پیار اور جملہ مکارم اخلاق دیکھے ہیں، اس کے بعد میں ان ﷺ کی ذاتِ بابرکات پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

رحمت عالم ﷺ زید کے اس فیصلہ سے اس قدر مطمئن اور مسرور ہوئے کہ زید کا ہاتھ پکڑا، کعبہ میں پہنچے، لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: آج سے زید میرا غلام نہیں میرا بیٹا ہے۔ لوگوں نے زید کو رشک اور حیرت سے دیکھا اور پھر مکہ کے گلی کوچوں میں ان کا نام زید بن محمد پکارا جانے لگا[1]۔

---

[1] أسد الغابة في معرفة الصحابة: 352,351/2، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 42,41/3.

مکہ کے ایک نوجوان نے نور اسلام سے منور ہونے کے بعد ہجرت کی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہُوا۔ اس کے سر پرست چچا نے اس سے ضرورت کی ہر چیز چھین لی۔ اس دور کے معاشرے کے لحاظ سے وہ ایک بہت ہی بڑے جرم کا مرتکب ہوا تھا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے خاندان والوں کی نظر میں اس سے بڑا کوئی پاپ نہیں تھا۔ اس سے تن کے کپڑے تک چھین لیے گئے۔ اُسے ایک ٹاٹ میسر آیا۔ اس نے ٹاٹ کے دو ٹکڑے کر لیے۔ ایک سے ستر چھپایا اور دوسرے سے اپنے جسم کے باقی حصے کو چھپانے کی کوشش کی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے اس حال میں دیکھا تو مشفق اور رحیم و کریم نبی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دریافت فرمایا: تمھارا نام کیا ہے؟ عرض کیا: عبدالعُزّیٰ، فرمایا: آج سے تم

عبداللہ ہو۔ چونکہ اس نے ٹاٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے اسے ذوالبجادین (ٹاٹ کے دو ٹکڑوں والا) کا خطاب دیا۔ اب ان کا نام عبداللہ ہوگیا اور یہ اصحابِ صفہ میں شامل ہو گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے ان ساتھیوں سے بے حد محبت فرماتے تھے، ان کے پاس بیٹھتے تھے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور ان کی مشکلات اور پریشانیوں کے حل میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ آپ غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے۔ دس ہزار سے زیادہ مجاہدین آپ کی معیت میں تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ان مجاہدین میں شامل تھے۔

رات کا وقت تھا۔ سارا لشکر سو رہا تھا۔ عبداللہ بن مسعود اٹھے۔ لشکر کے آخری کنارے پر روشنی نظر آئی۔ اللہ کے رسول کے بستر پر نظر ڈالی، بستر خالی تھا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بستر پر نظر دوڑائی وہ بھی موجود نہیں تھے۔ اب ان کا رخ روشنی کی طرف ہو گیا۔ دیکھا کہ اللہ کے رسول ﷺ قبر میں کھڑے ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی میت ہاتھوں میں تھام رکھی ہے جسے وہ اللہ کے رسول ﷺ کو پکڑا رہے ہیں۔ اللہ کے رسول! یہ کون خوش قسمت ہے جو آپ کے مبارک ہاتھوں سے لحد میں اتارا جا رہا ہے؟۔

ارشاد ہوا: یہ تمھارا بھائی عبداللہ ذوالبجادین ہے جو شام کو وفات پا گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے عبداللہ کے گالوں کے نیچے اپنے مقدس اور مبارک ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں آپ کے آنسو عبداللہ کے رخساروں پر یوں

ٹپک رہے تھے جیسے موتیوں کی لڑیاں گرتی ہیں۔ عبداللہ کو قبر میں اتارا، قبلہ رخ کیا اور بارگاہ الٰہی میں ہاتھ پھیلا دیے۔ اللہ رب العزت سے عرض کیا:

(اَللّٰهُمَّ أَمْسَيْتُ عَنْهُ رَاضِيًا فَارْضَ عَنْهُ) ''اے اللہ! آج شام تک، یعنی اس کی وفات تک میں اس سے راضی تھا تو بھی اس سے راضی ہو جا۔'' یہ الفاظ آپ ﷺ بار بار دہرا رہے تھے۔ واہ رے مقدر کے سکندر! امام انسانیت لحد میں اتار رہے ہیں۔ ابوبکر و عمر قبر پر کھڑے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ اس کے لیے بار بار دعائے مغفرت فرما رہے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود ہچکیاں لے کر رونے لگے۔ بے اختیار بولے: (يَا لَيْتَنِي كُنْتُ صَاحِبَ هَذَا الْقَبْرِ) ''کاش اس قبر میں دفن ہونے کی سعادت مجھے نصیب ہوتی۔''[1]

نبی کریم ﷺ پوری زندگی میں صرف پانچ مرتبہ قبر میں اترے ہیں ان میں سے ایک موقع عبداللہ ذوالبجادین کو نصیب ہوا۔ ایک دن حرم مکی میں اللہ کے رسول تشریف فرما تھے۔ اردگرد حضرت بلال، صہیب رومی، عمار بن یاسر اور ابن مسعود بیٹھے تھے۔ دین کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی دوران ابوجہل آ گیا اس نے دیکھا کہ سارے فقراء و مساکین آپ کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ وہ دولت کے خمار اور خاندانی فخر و تکبر کے نشہ میں چور ہو کر کہنے لگا: اے محمد! اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم بڑے لوگ، یعنی مکہ کے رؤساء آپ کے پاس بیٹھیں، آپ کی باتیں سنیں تو

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 182.181/4، والبداية والنهاية: 21/5، وصفة الصفوة: 679-677/1.

پھر ان فقیروں اور بے نواؤں کو اٹھا دیں۔ امت کے خیر خواہ نے سوچا: اس میں بظاہر کوئی حرج کی بات نہیں، کچھ دیر غور فرمایا اور طبیعت مائل ہوئی کہ ابوجہل کی بات مان لی جائے اور اپنے مسکین ساتھیوں کو تھوڑی دیر کے لیے اٹھا دوں شاید بڑے سردار راہ راست پر آ جائیں۔ ادھر یہ تصور کیا اُدھر اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیج کر یہ حکم سنایا:

﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، انہیں اپنے سے دور نہ کیجیے۔ ان کے حساب سے آپ کے ذمہ کچھ نہیں اور نہ آپ کے حساب سے کچھ ان کے ذمہ ہے، لہٰذا اگر آپ انہیں دور ہٹائیں گے تو بے انصافوں میں شمار ہوں گے۔''[1]

چنانچہ رسول رحمت ﷺ نے فقراء و مساکین کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ ان کی ہر موقع پر حوصلہ افزائی کی اور انہیں معاشرے میں باعزت مقام عطا فرمایا۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے سے ایک صحت مند خوشحال شخص گزرا۔ آپ ﷺ نے پاس بیٹھے صحابۂ کرام سے پوچھا:

---

[1] الأنعام 52:6، وتفسیر ابن کثیر: 183/2۔

ساتھیو! اس شخص کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ صحابہ نے کہا: یہ لوگوں میں نہایت نمایاں اور معروف آدمی ہے، اشراف میں سے ہے۔ اگر کسی گھرانے کو پیغام نکاح بھجوائے تو قبول کیا جائے گا۔ اگر کسی کی سفارش کرے تو مان لی جائے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور شخص کا گزر ہوا۔ پوچھا: ساتھیو! اس شخص کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ کہنے لگے: یہ مسلمانوں میں سے ہے۔ فقیر ہے۔ بالکل معمولی سا آدمی ہے۔ اگر کسی گھرانے میں پیغامِ نکاح بھجوائے تو کوئی اسے قبول نہ کرے گا۔ نہ اس کی کوئی سفارش مانی جائے گی۔ اگر مجلس میں بات کہے تو کوئی اسے سننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

قارئین کرام! اب ذرا نبی کریم ﷺ کے الفاظ پر غور فرمائیں۔ اس رسول رحمت وشفقت ﷺ نے نیک اور صالح غریبوں، ناداروں کس مپرسوں اور بے نواؤں کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: (هَذَا خَيْرٌ مِّنْ مِّلْءِ الْأَرْضِ مِثْلَ هَذَا) ''اس خوشحال آدمی جیسوں سے ساری زمین بھری ہوئی ہو تو یہ غریب اور مسکین آدمی ان سب سے بہتر ہے۔''[1]

[1] صحیح البخاري، حدیث:6447,5091.

44

کھجور کا تنا رونے لگا

مسجد نبوی کی چھت کھجور کے تنوں پر بنائی گئی تھی، یعنی کھجور کے تنوں سے ستونوں کا کام لیا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ کھجور کے ایک تنے کے سہارے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی خطبہ لمبا ہو جاتا تھا، اس لیے ایک انصاری عورت نے آپ ﷺ کی سہولت کے لیے گذارش کی: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم آپ ﷺ کے لیے ایک منبر نہ بنا دیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے اس تجویز سے اتفاق فرمایا تو آپ کے لیے جھاؤ کے درخت سے تین سیڑھیوں والا ایک منبر تیار کیا گیا۔ جمعۃ المبارک کا دن آیا تو آپ تنے کی بجائے منبر کی طرف تشریف لے گئے۔ وہ تنا، غمِ فراق سے رونے لگا۔

صحیح بخاری میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن (خطبہ کے وقت) ایک درخت یا کھجور کے تنے کے پاس کھڑے ہوتے

تھے۔ایک انصاری نے پیش کش کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہم آپ کے لیے ایک منبر نہ بنا دیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جیسے تمھاری مرضی۔''

تو انصاری نے آپ کے لیے ایک منبر بنوا دیا۔ جمعہ کا دن ہوا۔ آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو وہ تنا بچے کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔ نبی کریم ﷺ منبر سے اترے اور اس تنے کو آغوش میں لے لیا تو وہ اس بچے کی طرح ہچکیاں لینے لگا جسے بہلا کر چپ کرایا جا رہا ہو۔ تنے کا رونا، فراق رسول ﷺ اور ذکر اللہ سے محرومی کی بنا پر تھا جسے وہ پہلے قریب سے سنا کرتا تھا۔[1]

غرض تنے کے رونے کا واقعہ بہت مشہور ہے اور اس کی احادیث متواتر ہیں۔ صحیح روایت کی پابندی کرنے والے تمام محدثینِ کرام نے اسے اپنی صحاح میں بیان کیا ہے۔مزید برآں یہ واقعہ دس سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا ہے۔

منبر 8 ہجری میں بنایا گیا، اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ نبی کریم ﷺ تیسری سیڑھی پر تشریف فرما ہوتے تھے اور اپنے پاؤں مبارک دوسری سیڑھی پر رکھتے تھے۔ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ ازراہ ادب دوسری سیڑھی پر بیٹھتے تھے اور پاؤں پہلی سیڑھی پر رکھتے تھے۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو تقریر کے وقت پہلی سیڑھی پر کھڑے ہوتے تھے اور بیٹھتے وقت پاؤں زمین پر رکھ لیتے تھے۔ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو چھ سال تک تو وہ اسی طریقے پر عمل پیرا رہے، بعدازاں وہ

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 2095.

نبی کریم ﷺ ہی کی جگہ پر بیٹھنے لگے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لیے آئے تو انہوں نے منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کر دیا۔ لیکن اصل منبر نبوی کو اضافی سیڑھیوں کے اوپر ہی رکھا گیا اس طرح بیٹھنے کی جگہ سمیت منبر کی نو سیڑھیاں بن گئیں۔

منبر کے بارے میں آپ کے فرمودات اس کے بلند مرتبہ کو واضح کرتے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میرے گھر اور منبر کا درمیانی ٹکڑا جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور میرا منبر میرے حوض (کوثر) پر ہوگا۔''

''جنت کا باغیچہ ہونے'' سے مراد یہ ہے کہ نزول رحمت اور حصول سعادت کے لحاظ سے وہ ٹھیک جنت کے باغیچے کی طرح ہے کیونکہ وہاں ہر وقت اللہ کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ یا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جگہ پر کی گئی عبادت جنت تک پہنچا دیتی ہے۔ اس سے ظاہری مطلب بھی مراد ہو سکتا ہے کہ یہ حصہ حقیقتاً جنت ہی کا حصہ ہو گا، یعنی قیامت کے بعد یہ حصہ جنت میں منتقل کر دیا جائے گا۔ علماء نے یہ سب مطالب بیان کیے ہیں۔ [1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 1888، و فتح الباري: 4/130.

وہ جو آپ کے صبر و تحمل کا امتحان لینے آیا

زید بن سعنہ ایک یہودی عالم تھا۔ اس نے تورات شریف میں آپ کی صفات پڑھ رکھی تھیں۔ حق کا متلاشی تھا۔ نبی کریم ﷺ کی صداقت کی تمام علامات اس پر واضح ہو چکی تھیں۔ صرف دو صفتیں ایسی تھیں جن کی وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ ایک یہ کہ (يَسْبِقُ حِلْمُهُ جَهْلَهُ) ''آپ ﷺ کا تحمل آپ ﷺ کے غصہ پر غالب ہوگا۔'' دوسری صفت (وَلَا يَزِيدُهُ شِدَّةُ الْجَهْلِ عَلَيهِ إِلَّا حِلْمًا) ''ان سے شدید جہالت کے سلوک کے باوجود ان کے حلم میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔''

یہ دونوں صفات مکارم اخلاق کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہیں۔ بھلا ایسا کون ہے جس سے بدتمیزی کی جائے اور وہ اس کے جواب میں اچھا سلوک کرے۔ زید بن سعنہ مختلف بہانوں سے آپ کی مجالس میں آتا تھا، ملاقات کرتا تھا اور مذکورہ صفات کو آپ کی ذات گرامی میں دیکھنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ تھوڑے ہی

دن گزرے تھے کہ اسے یہ موقع میسر آ گیا۔ زید کے اپنے الفاظ یہ ہیں: میں آپ کی مجلس میں تھا۔ ایک اعرابی آیا۔ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے علاقے کے کچھ لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ اب انہیں قحط اور فقر و فاقہ کا سامنا ہے۔ اگر انہیں فوری مدد نہ ملی تو خطرہ ہے کہیں وہ اسلام سے نکل نہ جائیں۔ آپ سے امداد کا طالب ہوا۔ اس وقت آپ کے پاس رقم نہیں تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک پلان بنایا اور اللہ کے رسول ﷺ سے کہا: میں آپ کے لیے فلاں آدمی کے باغ سے ایک وسق کھجور خرید لیتا ہوں (وسق تقریباً 200 کلوگرام کا ہوتا ہے) اور آپ کو دے دیتا ہوں آپ کھجوریں کچھ دن کے بعد دے دیجیے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کسی خاص شخص سے خریدنے کی بات نہ کرو بلکہ تم مجھ سے یہ کھجوریں ایک خاص مدت کے بعد وصول کر لینا اور ادائیگی ابھی کر دو۔ میں نے اپنی پوٹلی کھولی اس میں سے 80 دینار نکالے اور آپ ﷺ کے حوالے کر دیے۔ آپ ﷺ نے اسی وقت اعرابی کو بلایا اور اسے رقم دے کر فرمایا: اپنے علاقے میں فوراً واپس چلے جاؤ اور لوگوں کی مدد کرو۔

ابھی کھجوروں کی ادائیگی کے وعدے کی میعاد میں دو تین دن باقی تھے کہ میں نے ان کے تحمل و بردباری کی آزمائش کا فیصلہ کر لیا۔ ایک جنازے کی ادائیگی کے لیے آپ حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنت البقیع تشریف لے گئے۔ جنازہ سے فارغ ہوئے تو میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق اچانک آپ کی چادر پکڑ لی اور اتنے زور سے کھینچی کہ وہ آپ کے کندھے سے اتر گئی اور ساتھ ہی نہایت کرخت لہجہ میں کہا: محمد (ﷺ)!

میرا قرض واپس نہیں کرو گے؟ تم بنو عبدالمطلب کے لوگ قرض واپس کرنے میں اچھے نہیں ہو۔ ادائے قرض میں بہت دیر کرتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ لوگوں سے تمھارے معاملات کی کیا حالت ہے!

زید کا یہ مطالبہ نہایت غیر معقول تھا۔ کیونکہ ابھی وعدے کی مدت میں کئی دن باقی تھے اور پھر انداز ایسا بازاری جس میں پورے خاندان کو گھسیٹا گیا ہو، کسی بھی شخص کو غصہ دلانے کے لیے کافی تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے اور اس کی بکواس سن رہے تھے۔ وہ بھلا کہاں خاموش رہنے والے تھے۔ فوراً بولے: او اللہ کے دشمن! تمھاری یہ جرأت کہ تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی گھٹیا گفتگو کر رہے ہو۔ یہ میں کیا دیکھ سن رہا ہوں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! اگر مجھے ان کی پاسداری نہ ہوتی تو تمھاری اس بدتمیزی پر تمھاری گردن اُڑا دیتا۔ تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم ایسی واہیات گفتگو کرو۔ اب ذرا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ردعمل ملاحظہ فرمائیں۔ اتنی سخت گفتگو سننے کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشتعل نہیں ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ موجود رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کیا اور فرمایا: عمر! ایسی بات نہ کرو بلکہ ﴿أَنْ تَأْمُرَنِي بِحُسْنِ الْأَدَاءِ وَ تَأْمُرَهُ بِحُسْنِ اتِّبَاعِهِ﴾ ''تمھیں چاہیے تھا کہ تم مجھ سے یہ کہتے کہ میں اس کا قرض خوش اسلوبی سے ادا کروں اور اسے یہ سمجھاتے کہ میاں! قرض کا تقاضا بھلے طریقے سے کرو۔''

پھر حکم دیا: عمر جاؤ اور اس کا قرض واپس کرو اور ہاں چونکہ تم نے اسے ڈرایا، دھمکایا ہے، اس لیے اسے بیس صاع (قریباً 50 کلو) کھجوریں زیادہ ادا کرو۔

زید بن سعنہ نہایت توجہ سے یہ گفتگو سن رہا تھا اور حیران تھا کہ اس قدر اشتعال انگیز گفتگو کے باوجود بھی آپ ﷺ حسب سابق تبسم کناں ہیں، بلاشبہ آپ کا حلم آپ کے غصہ پر سبقت لے گیا ہے۔ زید کہتے ہیں:

عمر فاروق رضی اللہ عنہ مجھے ساتھ لے کر بیت المال گئے۔ میرا قرض واپس کیا اور حسب ہدایت بیس صاع کھجوریں زیادہ بھی دیں۔ میں نے کہا: عمر کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں تم ہی بتاؤ۔ تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں زید بن سعنہ ہوں۔ کہنے لگے: اچھا الحبر، یعنی وہی جو مشہور یہودی عالم ہے۔ میں نے کہا کہ جی ہاں الحبر۔ اب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ جو تم نے اللہ کے رسول ﷺ سے گفتگو کی ہے اور ان کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آئے ہو تمھیں اس کا ہرگز کوئی حق نہیں تھا۔

میں نے کہا: عمر! تم ٹھیک کہتے ہو مگر تمھیں معلوم نہیں کہ میں حق کا متلاشی تھا۔ میں نے نبوت کی تمام صفات آپ میں دیکھ لی تھیں۔ دو صفتیں باقی رہ گئی تھیں۔ جن کا تعلق آپ کے تحمل، حوصلہ مندی اور بردباری سے تھا۔ آج میں نے ان صفات کا بھی خوب مشاہدہ کر لیا ہے۔ بلاشبہ وہ نبی آخر الزماں ہیں۔ عمر! میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں آج سے سچے دل سے اسلام قبول کرتا ہوں، پھر کلمہ طیبہ پڑھا اور صحابیت کے شرف سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کے اسلام لانے کا یہ واقعہ طبرانی، ابن حبان، حاکم، بیہقی، ابونعیم اور ابوالشیخ نے اخلاق النبی ﷺ کے باب میں بیان کیا ہے۔[1]

---

[1] دلائل النبوة للبیہقي: 6/278-280، والأحاديث الطوال للطبراني، ص: 24-26.

الشفاء میں قاضی عیاض رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تھا۔ آپ کے جسم اطہر پر گاڑھے حاشیے والی چادر تھی۔ ایک بدو آیا اس نے آپ ﷺ کی چادر اتنے زور سے کھینچی کہ آپ کے مبارک کندھے پر نشان پڑ گئے، پھر وہ نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا: اے محمد (ﷺ) میرے ان دو اونٹوں پر اللہ کا مال لدواؤ۔ اور ہاں سن لو، یہ مال نہ تمھارا ہے نہ تمھارے باپ کا ہے۔ آپ بدو کی اس بے ہودہ گفتگو پر خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا: سنو! مال تو اللہ کا دیا ہوا ہے۔ میں اس کا بندہ ہوں لیکن تم نے مجھ سے جو بدتمیزی کی ہے اس کا بدلہ تو لیا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کی بات تو درست ہے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا کریں گے نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: آخر کیوں؟ وہ بولا: ﴿ لِأَنَّكَ لَا تُكَافِئُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ ﴾ "اس لیے کہ آپ برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتے۔" اللہ کے رسول ﷺ اس کا جواب سُن کر مسکرا دیے، پھر حکم دیا کہ بدو کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔ [1] قارئین کرام! یہ ہے ہمارے پیارے رسول ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کی ایک جھلک۔ کیا دنیا میں ان جیسا کوئی اور ہے؟

ع...... کوئی کہاں سے تمھارا جواب لائے گا؟

---

[1] الشفا 1/140.

46

رحمت عالم کو عزیز از جاں سمجھنے والے جاں نثار

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ والی حدیث اور واقعہ بڑا مشہور ہے کہ انھوں نے اللہ کے رسول سے عرض کیا: اللہ کی قسم! آپ مجھے اپنی جان کے علاوہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز اور محبوب تر ہیں۔ ارشاد ہوا: اے عمر! جب تک تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہیں جانو گے اس وقت تک تم سچے مسلمان نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے آپ کا حکم سنا تو فوراً عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز اور محبوب تر ہیں۔ ارشاد ہوا: عمر! اب بات بنی!، یعنی اب جبکہ تم نے مجھ سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کی ہے تو اب تمھارا ایمان کامل ہو گیا۔ [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:6632.

تھے۔ تاریخ عالم میں اس محبت کی مثال نہیں ملتی۔ نہ آئندہ ایسا کوئی امکان ہے۔ قیامت تک کوئی شخص کوئی قوم یا گروہ اپنے قائد سے ایسی بے مثال محبت کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ بلاشبہ صحابہ کی محبت درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

حدیبیہ کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ عمرہ کرنے کے لیے مدینہ طیبہ سے نکلے۔ حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ یہ آج کل مکہ مکرمہ میں الشمیسی کا علاقہ بنتا ہے۔ چونکہ آپ مدینہ سے لڑائی کے لیے نہیں نکلے تھے، محض عمرہ کا ارادہ تھا، اس لیے قربانی کے جانور بھی ہمراہ تھے۔ ادھر قریش نے مسلمانوں کو مکے میں داخل ہونے سے روکنے کا تہیہ کر لیا۔

اللہ کے رسول ﷺ جو امن و آشتی کے سب سے بڑے نقیب اور علمبردار تھے، قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ باہمی خوں ریزی ہو وہ تو صرف اپنے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ اللہ کے گھر کی زیارت اور اس کے طواف کے لیے آئے تھے۔ دونوں طرف سے سفیر بھیجے گئے۔ قریش نے سب سے پہلے بدیل بن ورقاء کو بھیجا۔ آپ ﷺ نے اُسے آگاہ فرمایا: میں صرف عمرہ کرنے آیا ہوں، لڑائی کے لیے نہیں آیا، پھر قریش نے حلیس بن علقمہ کو بھیجا۔ آپ نے پھر اپنا پہلا ارشاد گرامی دہرایا، پھر ایک اور ذہین وفطین شخص عروہ بن مسعود ثقفی مذاکرات کے لیے آپہنچا۔ اس وقت کے رواج کے مطابق اس نے دوران گفتگو اللہ کے رسول ﷺ کی ڈاڑھی مبارک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ادھر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ تلوار سونتے سائے کی طرح ساتھ کھڑے تھے۔ جونہی اس نے ہاتھ آگے بڑھایا، حضرت

مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مار دیا کہ اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لو۔ یہ ہمارے عظیم قائد کی شان میں گستاخی ہے مگر عروہ عادت سے مجبور تھا۔ جب بھی ہاتھ آگے بڑھاتا، مغیرہ پلک جھپکتے میں آگے بڑھتے اور ڈاڑھی مبارک کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ پیچھے دھکیل دیتے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مذاکرات کے بعد عروہ بن مسعود واپس مکہ پہنچا۔ قریش مکہ منتظر تھے کہ دیکھیں، وہ کیا خبر لاتا ہے۔ اس نے واپس آ کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مذاکرات کا حال بیان کیا۔ آپ کے صحابہ کی عقیدت اور آپ کی عظمت و وقار کے بارے میں قریش کو رپورٹ پیش کی۔ اس نے کہا: مکہ والو! میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ میں نگر نگر گھوما ہوں۔ میں نے بڑے بڑے ایوان ہائے شاہی دیکھے ہیں۔ میں بادشاہوں کے درباروں میں گیا۔ میں نے شہنشاہ ایران کا جاہ وجلال دیکھا۔ میں نے قیصر روم کا دربار دیکھا۔ مجھے نجاشی بادشاہ کے پاس بطور ایلچی جانے کا موقع ملا۔ اللہ کی قسم! میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کو اپنے نبی سے جو بے پایاں محبت، اظہار عقیدت اور عزت و احترام کرتے دیکھا ہے وہ کسی اونچے سے اُونچے شہنشاہ کو بھی نصیب نہیں۔ سلاطین عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے بونے ہیں۔ میں نے کسی بادشاہ سے اُس کے درباریوں اور وفاداروں کا ایسا اظہار محبت نہیں دیکھا جیسا اظہار محبت میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان کے ساتھیوں کا دیکھا۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھوکتے ہیں تو ان کے جاں نثار اسے زمین پر نہیں گرنے دیتے۔ بلکہ بطور تبرک اپنے ہاتھوں اور چہرے پر مل لیتے ہیں۔ وہ بال کٹواتے ہیں تو جاں نثاران محمد

انہیں آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور اپنے پاس عقیدت ومحبت سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ وہ کسی کام کا اشارہ کرتے ہیں تو تعمیل ارشاد کے لیے لپک پڑتے ہیں۔ وہ آپس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے حکم کی خوب سے خوب تر بجا آوری میں کیسے سبقت حاصل ہو۔ جب محمد (ﷺ) وضو کرتے ہیں تو وہ منظر دیکھنے والا ہوتا ہے۔ محمد ﷺ کے فدائی ان کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے۔ بلکہ اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔ جب وہ محمد (ﷺ) سے کوئی بات کرتے ہیں تو ادب اور احترام کے باعث ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی نگاہیں جھکا لیتے ہیں۔ کسی کو آنکھ اٹھا کر ان کا رُخِ زیبا دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

میں نے ایک ایسی قوم دیکھی ہے جو محمد ﷺ پر اپنی جانیں قربان کرنے کو اپنی سب سے بڑی خوش نصیبی تصور کرتی ہے۔ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے قبل تمہیں سو بار سوچنا ہوگا۔[1]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام 3/340-343، والرحیق المختوم، ص461-463.

یہ سن دو ہجری کی بات ہے۔ رمضان المبارک کے مہینہ میں ابوسفیان کی قیادت میں ایک تجارتی قافلہ واپسی کے سفر میں شام سے مکہ کی جانب رواں دواں تھا۔ اس قافلے میں ایک ہزار اونٹ تھے اور ان پر 262 کلو سونے کی مالیت کا ساز و سامان لدا ہوا تھا۔ حفاظت پر صرف چالیس افراد مامور تھے۔ آج کل کے حساب سے یہ سامان کم و بیش 18 ملین ریال کی مالیت کا تھا جس پر بڑے آرام سے قبضہ کیا جا سکتا تھا۔ اس سامان میں ان سینکڑوں مہاجرین کا چھینا ہوا مال بھی شامل تھا جو محض اپنا دین بچا کر خالی ہاتھ مدینہ ہجرت کر کے پہنچے تھے۔ اور مدینہ میں فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے لیے یہ بڑا زریں موقع تھا کہ کسی طرح اس قافلے پر حملہ کر کے اس سامان پر قبضہ کر لیں اور اپنی معاشی حالت بہتر بنائیں۔ ادھر اہل مکہ کے لیے اس مال سے محرومی زبردست فوجی، سیاسی اور

اقتصادی مار کی حیثیت رکھتی تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان ہوا کہ قریش کا قافلہ مال و دولت لیے چلا آ رہا ہے، اس لیے نکل پڑو۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بطور غنیمت تمھارے حوالے کر دے۔ کسی پر روانگی کے لیے زور نہیں ڈالا گیا نہ اس میں شمولیت کو ضروری قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے صحابہ کرام مدینہ ہی میں رہ گئے۔ اس بات کی قطعاً توقع نہ تھی کہ بدر کے میدان میں معرکہ فرقان برپا ہوگا۔ یہ جنگ کوئی معمولی جنگ نہ تھی اس جنگ میں بلاشبہ کفر اور اسلام کے درمیان مکمل طور پر ہمیشہ کے لیے صحیح فیصلہ ہو گیا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے طلحہ بن عبیداللہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم کو قافلے کے حالات کا پتہ چلانے کے لیے شمال کی جانب روانہ فرمایا۔ انھوں نے آپ ﷺ کو قافلے کے بارے میں اطلاعات فراہم کیں۔ ابوسفیان بھی بے حد چوکنا تھا۔ اسے قافلے کی اہمیت اور اس کے ساز و سامان کی بھاری مالیت کا خوب علم تھا۔ بدر کے قریب پہنچا تو خود قافلے سے آگے جا کر حالات کا جائزہ لیا۔ مجدی بن عمرو نامی ایک شخص سے پوچھا کہ کہیں مدینہ سے کوئی لشکر تو نہیں آ رہا؟ اس نے کہا: میں نے کوئی خاص بات تو نہیں دیکھی، البتہ دو آدمی آئے تھے، انھوں نے ٹیلے کے پاس اپنے جانور بٹھائے اور کنویں سے اپنے مشکیزے بھر کے چلے گئے۔ ابوسفیان وہاں پہنچا۔ اونٹ کی مینگنیاں اٹھا کر توڑیں۔ اس میں کھجور کی گٹھلی برآمد ہوئی۔ اس نے کہا: خدا کی قسم! یہ تو یثرب کا چارہ ہے۔ اس کے بعد اس نے تیزی سے قافلے کا رخ تبدیل کیا اور مغرب کی طرف موڑ کر اس کا رخ ساحل کی طرف کر دیا۔ اس

طرح اُس نے قافلے کو مدنی لشکر کے قبضے میں جانے سے بچا لیا۔

دریں اثنا ابوسفیان کو معلوم ہو چکا تھا کہ محمد ﷺ نے صحابہ کرام کو قافلے پر حملے کا حکم دے دیا ہے۔ اس نے فوراً ضمضم بن عمرو غفاری کو اجرت دے کر مکہ بھیجا کہ قافلے کی حفاظت کے لیے قریش سے مدد طلب کرے۔ ضمضم نہایت تیزی سے مکہ آیا، پھر زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق اونٹ کی ناک چیری، کجاوہ الٹا دیا، کرتا پھاڑ دیا۔ اور اونٹ پر بیٹھ کر قریش کو دہائی دینے لگا: قافلے کو بچاؤ۔ مدد کرو...... مدد کرو......۔ لوگ اِس آواز کی طرف دوڑ پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں پورے مکہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ محمد (ﷺ) قافلے پر حملہ کرنے والے ہیں، لہٰذا اس کی حفاظت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اب کیا تھا، سارے مکہ سے ہر شخص جنگ کے لیے نکل آیا اور دوسروں کو بھی نکلنے کی ترغیب دینے لگا۔ سوائے آپ کے چچا ابو لہب کے کہ اس نے اپنی جگہ اپنے ایک مقروض کو بھیج دیا۔ اردگرد کے قبائل سے بھی مدد طلب کی گئی۔ اور آناً فاناً ابوجہل کی قیادت میں تیرہ سو کی تعداد میں ایک لشکر جرار بدر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک سو گھوڑے اور چھ سو زرہیں تھیں۔ قریش کے نو معزز افراد نے رسد کی ذمہ داری لی۔ قریش کا لشکر جحفہ پہنچا تو انہیں ابوسفیان کا پیغام موصول ہوا کہ قافلہ بچ نکلا ہے، لہٰذا تمھاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ واپس چلے جاؤ۔ لشکر نے واپسی کا ارادہ کیا تو ابوجہل نہایت تکبر سے کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا: خدا کی قسم! ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ ہم بدر جائیں گے۔ وہاں تین دن قیام کریں گے۔ اونٹ ذبح ہوں گے، لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، شراب

پلائیں گے۔ مغنیات گانے گائیں گی۔ سارے عرب کو ہماری طاقت کا علم ہوگا۔ پورے علاقے پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔ بنوزہرہ کے تین سو افراد لشکر میں شامل تھے۔ بنوزہرہ کا حلیف اور اس لشکر میں ان کا سردار اخنس بن شریق بھی موجود تھا۔ اس نے ابوجہل کی مخالفت کی اور کہا کہ اب جب لڑائی کی کوئی وجہ ہی نہیں رہی تو ہمیں واپس جانا چاہیے۔ لوگوں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ بنی زہرہ کے تین سو افراد کو لے کر واپس چلا گیا۔

اس طرح اب قریش کے لشکر کی تعداد ایک ہزار رہ گئی۔ بدر کے قریب پہنچ کر ساڑھے پانچ میل لمبا اور چار میل چوڑا وسیع ریگستانی میدان تھا۔ جس کے اردگرد اونچے پہاڑ تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہاں بڑا میلہ لگتا تھا۔

ادھر اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ سے مقابلے کے لیے نکلے تو صرف تین سو تیرہ سرفروش ساتھ تھے۔ ان میں کمسن بچے بھی شامل تھے۔ بے سروسامانی کی حالت تھی۔ پورے لشکر میں صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا اور دوسرا حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا۔ ستر اونٹ تھے جن پر باری باری سوار ہو کر یہ ننھا سا لشکر بدر کی طرف آ رہا تھا۔ لشکر میں مہاجر 83 یا 86 تھے بقیہ انصار تھے۔ ان میں 61 قبیلہ اوس سے اور 170 قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ غزوے کا کوئی خاص اہتمام تھا نہ مکمل تیاری تھی۔ مدینہ کا انتظام پہلے حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت ابولبابہ بن منذر رضی اللہ عنہ کو سونپا گیا۔ مہاجرین کا جھنڈا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس اور انصار کا جھنڈا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے

پاس تھا۔ سپہ سالار اعلیٰ خود اللہ کے رسول ﷺ تھے۔

ابھی آپ بدر کے راستے میں ہی تھے کہ قافلے اور لشکر کی اطلاعات مل گئیں۔ آپ ﷺ نے یہ معلومات ملنے کے بعد حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا۔ مسلمانوں کا لشکر ہر چند کہ بہت چھوٹا تھا۔ سامان حرب بھی پاس نہ تھا مگر آپ ﷺ نے ایک ایسا ناگزیر قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا جو شاندار شجاعت و بسالت کا آئینہ دار تھا۔ آپ ﷺ نے سر بکف ہو کر کفر سے ٹکرانے کا فیصلہ فرما لیا، کیونکہ اگر مکی لشکر کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تو اس کی فوجی ساکھ کو بڑی قوت پہنچتی اور پورے علاقے میں ان کی دھاک بیٹھ جاتی اور ابوجہل جیسے دشمن اسلام سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ آگے بڑھ کر مدینہ پر حملہ کر دیتا۔ [1]

---

[1] ملخصا من السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 2/207-620، والرحیق المختوم، ص: 685-690.

48

اعلیٰ کمان سے مشورہ

اللہ کے رسول ﷺ بدر کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے راستے ہی میں اعلیٰ کمان کا اجلاس طلب فرمایا۔ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور ان کی رائے لی۔ سبحان اللہ! آپ ﷺ کے ساتھی کتنے جاں نثار تھے۔ آپ ﷺ کے اشارۂ ابرو پر اپنی گردن کٹوانے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ قائدین میں سے حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما اٹھے اور بڑی عمدہ باتیں کیں، پھر مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ اٹھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح نہیں کہ ہم کہیں کہ تم اور تمھارا رب جاؤ اور لڑو، ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے پروردگار چلیں اور لڑیں، ہم بھی آپ کے ساتھ لڑیں گے۔ آپ ﷺ نے ان کے لیے کلمۂ خیر کہا اور دعا دی، پھر ارشاد ہوا کہ مشورہ دو۔ اشارہ شناس قدموں میں بیٹھے تھے۔ سمجھ گئے کہ اشارہ انصار کی طرف ہے۔

اب انصار کے پرچم بردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اٹھے عرض کیا میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کہیں اشارہ ہماری طرف تو نہیں؟۔ ارشاد ہوا: ہاں۔ تو انھوں نے ایثار و قربانی کی پیش کش کرتے ہوئے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ انھوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں تو سمندر میں کود پڑیں۔ جس سے آپ لڑیں گے اُس سے ہم بھی لڑیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس سے تعلق توڑ لیں گے، ہم بھی اس سے تعلق توڑ لیں گے۔ جس سے تعلق استوار کریں گے اُس سے ہم بھی جڑ جائیں گے۔ ہم ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ ہمارے اموال اور ہماری جانیں آپ پر فدا ہیں۔ اگر آپ برک غماد (یمن کے ایک علاقے کا نام ہے) تک چلیں تو ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلیں گے۔ ان کی تقریر سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ [1]

[1] الرحیق المختوم، ص: 192,191.

دشمن کے احوال سے باخبری

بیدار مغز قیادت جنگی ماحول میں ہر طرف اور ہر معاملہ کی طرف توجہ دیا کرتی ہے۔ دشمن کہاں ہے؟ کب پہنچے گا؟ تعداد کتنی ہے؟ سامان حرب وضرب کتنا ہے؟ یہ بڑے اہم سوالات ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ مختلف وادیوں کو عبور کرتے اور پہاڑوں کو روندتے ہوئے بدر کے قریب ٹھہر گئے۔ اور پھر حالات کا جائزہ لینے کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر نکل پڑے۔ ابھی دور ہی سے مکی لشکر کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک بوڑھا عرب مل گیا۔ وہ آپ ﷺ کو نہیں پہچانتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے دونوں لشکروں کا حال پوچھا۔ دونوں لشکروں کے بارے میں پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کی شخصیت پر پردہ پڑا رہے بڑے میاں نے کہا کہ جب تک تم لوگ یہ نہیں بتاؤ گے کہ تمھارا تعلق کس قوم سے ہے؟ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ارشاد ہوا: جب تم ہمیں بتا دو گے تو ہم بھی تمھیں بتا دیں

گے۔اس نے کہا: اچھا! تو یہ اس کے بدلے کی بات ہے۔ ارشاد ہوا: ہاں۔اس نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی فلاں وقت مدینے سے نکلے تھے اور اب وہ اُس جگہ ہوں گے اور یہ وہی جگہ تھی جہاں اس وقت مدینہ کا لشکر ٹھہرا تھا اور قریش فلاں دن نکلے تھے اگر مجھے صحیح خبر ملی ہے تو آج وہ فلاں جگہ ہوں گے۔ بڈھے عرب نے ٹھیک ٹھیک اسی جگہ کا نام لیا جہاں مکی لشکر موجود تھا۔ جب بوڑھا اپنی بات پوری کر چکا تو کہنے لگا کہ اب یہ بتاؤ کہ تم دونوں کس قوم سے ہو؟ ارشاد ہوا: ہم لوگ پانی سے ہیں اور یہ کہہ کر واپس چل پڑے۔ بوڑھا بڑبڑاتا رہا پانی سے ہیں؟ تو کیا یہ عراق کے پانی سے ہیں؟[1]

[1] مختصر سیرۃ الرسول، ص: 268، والرحیق المختوم، ص:293.

50

جنگ کے شعلے

دشمن کی تعداد معلوم کرنے کے لیے مہاجرین میں سے تین سراغ رساں بھیجے گئے۔ یہ لوگ بدر پہنچے وہاں دو آدمی نظر آئے ایک قریشی تھا اور دوسرا عقبہ بن ابی معیط کا غلام تھا۔ قریشی تو موقع پا کر نکل بھاگا۔ غلام پکڑا گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ مشرکین کتنے ہیں؟ اس نے کہا: بہت زیادہ۔ چنانچہ درست بات اگلوانے کے لیے اس کی کچھ مرمت کی گئی۔ اس وقت اللہ کے رسول ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ فارغ ہوئے تو غلام سے دریافت فرمایا: وہ لوگ روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں۔ اس نے کہا کبھی نو اور کبھی دس۔ ارشاد ہوا کہ مشرکین کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے، پھر پوچھا کہ ان میں کون کون ہے؟ تو اس نے بڑے بڑے سرداروں کے نام اُگل دیے۔ ارشاد ہوا: مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمھارے پاس لا کر ڈال دیے ہیں۔

اشارۂ نبوی پر مسلمانوں نے بدر کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے تو رات بارش نازل ہوئی جو مشرکین پر خوب موسلا دھار برسی اور ان کی پیش قدمی میں رکاوٹ بن گئی۔ مگر مسلمانوں پر یہ بارانِ رحمت کی شکل میں پھوار بن کر برسی، زمین ہموار ہوگئی۔ ریت جم گئی۔ قدم ثابت قدمی سے جمنے کے لائق ہو گئے۔ قیام خوشگوار ہو گیا اور دل مضبوط ہو گئے۔ حضرت حُباب بن منذر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے قریش کے سب سے قریب ترین چشمہ پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حوض بنایا۔ باقی تمام چشموں کو بند کر دیا۔ یہ کام آدھی رات گئے انجام دیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے پانی کا حصول آسان ہو گیا۔ قریش نے وادی کے دہانے کے باہر اپنے کیمپ میں رات بسر کی۔ صبح اپنے دستوں سمیت ٹیلے سے اتر کر بدر کی جانب روانہ ہوئے۔ ایک گروہ پانی کے حوض کی طرف بڑھا۔ صحابہ نے اُسے روکنے کا ارادہ کیا تو ارشاد ہوا: انھیں چھوڑ دو۔ اس دن جس کافر نے بھی اس حوض سے پانی پیا وہ اس جنگ میں مارا گیا، صرف حکیم بن حزام باقی بچے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ مسلمانوں کا قیام پانی کے حوض کے قریب تھا اس کی حفاظت کے لیے ماہر نشانہ باز صحابہ کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ دشمن اس کے قریب نہ پھٹک سکیں تاکہ اس میں زہر وغیرہ نہ ملا سکیں۔ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ انصاری نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ مسلمان مرکز قیادت تعمیر کر دیں۔ جو میدان سے ذرا ہٹ کر ہو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہاں قیام فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سواریاں بھی مہیا رکھیں گے تاکہ اگر خدانخواستہ شکست ہوئی تو اس کے عواقب سے نمٹا جا سکے،

چنانچہ میدان جنگ کے شمال مشرق میں ایک اونچے ٹیلے پر چھپر بنایا گیا۔ وہاں سے پورا میدان جنگ نظر آتا تھا۔ اس مرکز کی نگرانی کے لیے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں انصاری نوجوانوں کا ایک دستہ منتخب کیا گیا۔ چھپر کو عربی زبان میں عریش کہتے ہیں۔ آج بھی بدر کا میدان دیکھنے جائیں تو اس مقام پر آپ کو بڑی خوبصورت مسجد نظر آئے گی۔ یہی وہ مبارک مقام ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے رو رو کر مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس میدان جنگ میں تشریف لے گئے۔ اور لشکر کی ترتیب قائم فرمائی۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں سے اشارہ فرماتے جاتے تھے کہ کل یہ فلاں کی قتل گاہ ہوگی ان شاء اللہ! اور یہ فلاں فلاں کی قتل گاہ ہے۔ ان شاء اللہ۔

یہ رات مسلمانوں نے بہت پرسکون طور پر بسر کی۔ ان کے دل اعتماد سے پُر تھے۔ انھیں اپنے رب کی طرف سے فتح و نصرت کا پورا یقین تھا۔

17 رمضان المبارک جمعہ کا دن تھا۔ اور یہی یوم الفرقان تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مسلمانوں کی صفیں درست فرمائیں۔ ارشاد ہوا: جب تک آخری احکام موصول نہ ہوں جنگ شروع نہ کریں۔ جب دشمن قریب آ جائے تو پھر ان پر تیر چلانا۔ اس معرکے کا سب سے پہلا مقتول اسود بن عبدالاسد تھا یہ بڑا متکبر اور بداخلاق شخص تھا۔ اس نے چیلنج دیا کہ میں مسلمانوں کے حوض سے پانی پی

کر رہوں گا۔ ورنہ اسے ڈھا دوں گا یا اس کے لیے جان دے دوں گا۔ اسے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے حوض کے قریب جالیا۔ اور واصلِ جہنم کر دیا۔ جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو قریش کے تین بہترین شہسوار عتبہ بن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ اور ولید جو عتبہ کا بیٹا تھا، میدانِ کارزار میں آ گئے۔ انھوں نے دور ہی سے دعوت مبارزت دی: کون ہے جو ہمارا مقابلہ کرے؟ دو انصاری نوجوان عوف اور معوذ جو عفراء بنت عبید کے بیٹے تھے اور تیسرے عبداللہ بن رواحہ نکلے۔ قریشیوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ جواب ملا: مدینہ سے تعلق ہے۔ کہنے لگے: تم شریف مدمقابل ہو۔ تمھاری بجائے ہم تو اپنے چچیرے بھائیوں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، پھر آواز لگائی: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری قوم کے افراد بھیجو۔ ارشاد ہوا: عبیدہ بن حارث، حمزہ اور علی رضی اللہ عنہم اٹھو اور مقابلہ کے لیے جاؤ۔ عبیدہ جو سب سے معمر تھے عتبہ کے رُوبرو ہیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شیبہ کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ولید کے مقابل کھڑے ہیں۔ مقابلہ شروع ہوا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا اپنا شکار مار لیا۔ لیکن اِدھر حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اور عتبہ میں لڑائی جاری تھی دونوں کو گہرا زخم لگا تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ عتبہ پر جھپٹ پڑے، وہ بھی واصلِ جہنم ہو گیا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کاری زخم کی وجہ سے چند دنوں کے بعد مدینہ واپس جاتے ہوئے خلعت شہادت سے سرفراز ہو گئے۔

اس مبارزت کا انجام مشرکین کے لیے بہت برا نکلا۔ انھوں نے شدید غیظ و غضب کے عالم میں یکبارگی حملہ کر دیا۔ مسلمان رب العزت سے فتح و نصرت کی

دعائیں مانگ رہے تھے اور اپنی جگہوں پر ڈٹے ہوئے مشرکین کے حملوں کو روک رہے تھے۔ زبان پر اَحد اَحد کا ایمان افروز کلمہ تھا۔ ادھر اللہ کے رسول ﷺ عریش میں آ گئے اور اللہ کی بارگاہ میں رو رو کر دعائیں مانگنے لگے: اے اللہ! تو نے جو مجھ سے وعدہ فرمایا ہے اُسے پورا فرما۔ اے اللہ! اگر آج یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو پھر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ اس تضرع کے ساتھ دعا فرمائی کہ آپ کے دونوں کندھوں سے چادر گر گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو آپ کے ساتھ تھے، چادر درست کی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ اب بس کیجیے یقیناً اللہ نے آپ کی دعا سن لی، آپ ﷺ عریش سے باہر تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے زرہ پہن رکھی تھی۔ آپ پُر جوش انداز میں میدان جنگ کی طرف بڑھے۔ مٹھی میں کنکریاں اور مٹی اٹھائی اور قریش کی طرف رخ کر کے ان کے چہروں کی جانب پھینک دی۔ فرمایا: (شَاهَتِ الْوُجُوه) یہ چہرے بگڑ جائیں۔ کوئی مشرک ایسا نہ تھا جس کے منہ، آنکھوں اور نتھنوں میں اس مٹی کے ذرات نہ گھس گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے: جب آپ ﷺ نے ......غبار...... پھینکا تو درحقیقت آپ ﷺ نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا تھا یعنی پھینکنے والے آپ تھے اور پہنچانے والا اللہ تھا۔[1]

---

[1] مختصر سیرۃ الرسول للشیخ عبداللہ، ص 268-274، والرحیق المختوم، ص: 293-302.

51

ابوجہل کی لاش

بدر کے میدان میں ایک انصاری صحابی جن کا نام عمیر بن حمام رضی اللہ عنہ تھا عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا جنت اتنی بڑی ہے کہ اس کی چوڑائی آسمان اور زمین کے برابر ہے؟! ارشاد فرمایا: ہاں، نہایت تعجب سے کہنے لگے بخ بخ، یعنی بہت خوب بہت خوب۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا یہ تم نے ''بہت خوب بہت خوب'' کیوں کہا؟ عرض کیا: اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! کوئی خاص بات نہیں۔ میں تو اللہ سے یہ امید کر رہا تھا کہ اللہ مجھے بھی اہل جنت میں سے کر دے۔ ارشاد ہوا: تم بھی جنت والوں میں سے ہو۔ صادق و مصدوق پیغمبر کی زبان اقدس سے جنت کی بشارت پانے والے عمیر نے اپنے توشہ دان سے کھجوریں نکالیں، پھر ایک کھجور اپنے منہ میں رکھی۔ اسے چبایا۔ اس سے کچھ توانائی اور طاقت حاصل کی، پھر دوسری اور تیسری کھجور منہ میں ڈالی۔ اور پھر آپ ہی آپ

کہنے لگے: اگر میں اتنی دیر تک زندہ رہا کہ یہ کھجوریں ختم کروں تو اس طرح یہ زندگی تو بہت لمبی ہو جائے گی، پھر فوراً کھجوریں پھینک دیں۔ اور دشمن سے جاٹکرائے اور لڑتے لڑتے اپنی جان قربان کر دی۔ [1]

غزوہ بدر کے آغاز ہی میں جب کافروں کے تین بڑے سردار واصل جہنم ہو گئے تو دشمن پر رعب چھا گیا۔ فرشتوں کی مدد بھی آ گئی۔ اس دوران ابوجہل نے اپنے لشکر کو ابھارا۔ کہنے لگا: تم پر عتبہ، شیبہ اور ولید کے قتل کا ہول سوار نہیں ہونا چاہیے۔ ان لوگوں نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ وہ اپنے لشکر سے نہایت متکبرانہ انداز سے خطاب کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: سراقہ کی کنارہ کشی سے تم پر ہراس طاری نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے تو محمد سے پہلے ہی ساز باز کر رکھی تھی۔ تمھیں پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ (واضح رہے کہ بدر کے دن شیطان سراقہ بن مالک کی شکل میں کفار کی ہمت بندھانے آیا اور ان سے کہا ڈٹے رہنا میں اپنے قبیلہ سمیت تمہارے ساتھ ہوں، مگر جب اس نے فرشتوں کو دیکھا تو بھاگ نکلا) ابوجہل کو اپنے غرور کا خمیازہ جلد ہی بھگتنا پڑا۔ اسے دونو عمر انصاریوں معاذ بن عمرو بن جُموح اور معاذ بن عفراء نے دیکھتی آنکھوں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ [2]

ابوجہل کی گردن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کاٹی، چنانچہ اس کی تلوار انہی کو ملی۔ ابوجہل کی گردن کاٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دی گئی۔ اللہ

---

① صحیح مسلم، حدیث: 1901.

② صحیح البخاري، حدیث: 3141، والرحیق المختوم، ص 306,305.

کے رسول ﷺ نے اللہ کی حمد اور توصیف کی، پھر فرمایا: چلو مجھے اس کی لاش دکھاؤ۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: ابو جہل کی لاش تلاش کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے، ارشاد ہوا کہ اس کی ٹانگ پر زخم کا نشان ہے۔ صحابہ نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ نبوت سے پہلے عبداللہ بن جدعان کے گھر میری اس سے کشتی ہوئی تھی اور میں نے اسے پچھاڑ دیا تھا۔ اس موقع پر ابو جہل کی ٹانگ پر چوٹ لگی تھی، چنانچہ ابو جہل کی لاش تلاش کی گئی اور آپ کو اطلاع دی گئی۔ آپ ﷺ نے جا کر لاش دیکھی اور ارشاد فرمایا: یہ اس امت کا فرعون ہے![1]

[1] البدایۃ والنہایۃ: 3/300-302، والرحیق المختوم، ص: 307,306.

52

امام الانبیاء سے محبت کا ایک اور انداز

غزوہ بدر کے موقع پر آپ ﷺ کے ہاتھ میں تیر ہے۔ صحابہ کرام کی صف بندی کی جا رہی ہے۔ جذبہ شہادت سے سرشار صحابہ کرام سینہ تانے کھڑے ہیں۔ آپ تیر کے اشارے سے ان کی صفیں سیدھی کر رہے ہیں۔ سواد بن غزیہ نامی ایک صحابی سینہ تانے تھوڑا سا صف سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ارشاد رسالت ہوا: سواد برابر ہو جاؤ۔ صف میں سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور ساتھ ہی اس کے پیٹ پر تیر رکھ کر قدرے دبا دیا۔

انھوں نے موقع غنیمت جانا، کہنے لگے: اللہ کے رسول ﷺ آپ نے مجھے تکلیف دی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حق اور انصاف کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ مجھے بدلہ دیجیے۔ اللہ اللہ! آپ ﷺ کی تواضع دیکھیے اپنے بطنِ مبارک سے فوراً کپڑا ہٹا دیا۔ فرمایا: اپنا بدلہ لے لو۔ سواد تو موقع کے منتظر تھے۔ فورا آپ سے چمٹ گئے اور آپ کے پیٹ کو والہانہ چُومنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت

فرمایا: سواد! یہ حرکت کرنے پر تمھیں کس چیز نے آمادہ کیا؟ سواد کی محبت اور سوچ پر غور فرمائیں اللہ کے رسول ﷺ سے کتنی زبردست محبت ہے۔ کہنے لگے: اللہ کے رسول! آپ بھی ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ حالتِ جنگ درپیش ہے، زندگی کا کیا بھروسہ؟ اس حالت میں میری تمنا یہ تھی کہ میرا آخری عمل یہ قرار پائے کہ آپ ﷺ کے مبارک جسم سے میرا جسم چُھو جائے۔ پیارے نبی ﷺ نے جب اپنے صحابی کی یہ محبت اور جذبۂ شوق دیکھا تو اس کے لیے دعائے خیر فرمائی۔[1]

غزوۂ احد کے موقع پر جبلِ رماۃ پر متعین سواروں کی غلطی کی وجہ سے فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ دُشمنوں کی یلغار کی وجہ سے صحابہ کرام تتر بتر ہو گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ سات انصاری اور دو قریشی باقی رہ گئے۔ کفار بار بار اللہ کے رسول پر حملہ کر رہے ہیں۔ صحابہ مدافعت کر رہے ہیں۔ ساتوں انصاری یکے بعد دیگرے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ اب صرف دو قریشی جوان سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ رہ گئے ہیں۔ دُشمنوں کے حملے میں مزید شدت آ گئی۔ ادھر ان دونوں نے جواں مردی اور بہادری کی ایسی مثال قائم کی کہ دُشمنوں کے تمام قاتلانہ وار ناکام بنا دیے۔ طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو 39 زخم آئے۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف بڑھتے ہوئے تیر کو اپنے ہاتھ پر روک لیا جس سے ان کے ہاتھ کی انگلیاں شل ہوگئیں۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی کا نہایت نازک لمحہ تھا، مشرکین نے اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ عبداللہ بن قمئہ نے تلوار کا وار کیا آپ ﷺ کے خود کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک کے اندر دھنس گئیں۔

---

[1] السیرة النبویة لابن ہشام: 238/2، والسیرة النبویة في ضوء المصادر الأصلیة: 421/1.

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آگے بڑھے تا کہ ان کڑیوں کو باہر نکالیں۔ اس دوران ابوعبیدہ بن جراح اور دیگر جانثار صحابہ رضی اللہ عنہم دیوانہ وار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گئے۔ ابوعبیدہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نہایت عاجزی سے درخواست کرنے لگے۔ بھائی ابوبکر! یہ سعادت مجھے حاصل کرنے دیجیے کہ کڑیاں میں نکالوں۔ ان کی منت سماجت کی، انہیں قسم دی اور ان کی موافقت پا کر آگے بڑھے۔ نہایت محبت سے کڑی کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ نہایت محبت اور آرام سے مگر پوری قوت سے آہستہ آہستہ لوہے کی کڑی باہر نکال لی۔ اس دوران ان کے سامنے کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ اب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر آگے بڑھے تا کہ دوسری کڑی کو وہ باہر نکالیں۔ مگر ابوعبیدہ بن جراح کی محبت دیکھیے کہ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی منتیں کر رہے ہیں اور رہ رہ کر کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اللہ کی قسم! اس سعادت سے مجھے محروم نہ کریں۔ میری آرزو ہے کہ دوسری کڑی نکالنے کی سعادت بھی مجھی کو نصیب ہو۔ ان کی رضامندی سے پھر آگے بڑھے۔ اور دوسری کڑی کے سرے پر دانت جما کر آہستہ آہستہ باہر کھینچنے لگے، آہستہ آہستہ اس لیے کھینچا تا کہ اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف میں اضافہ نہ ہونے پائے۔ بالآخر دوسری کڑی بھی باہر نکال دی اور اس کوشش میں ان کا دوسرا دانت بھی ٹوٹ گیا۔ اللہ اللہ! یہ کیسی بے مثال محبت ہے، کتنی رفیع الشان سعادت ہے کہ دونوں دانت ٹوٹ گئے مگر اس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ تو اس سعادت پر پھولے نہ سماتے تھے کہ انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے دونوں اذیت ناک کڑیاں باہر نکال پھینکی ہیں۔[1]

---

[1] زاد المعاد: 3/197، صحیح البخاري، حدیث: 4075، وصحیح مسلم، حدیث: 1790، السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 3/88-90.

53

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا بے خطا نشانہ!

غزوۂ بدر میں جرأت وشجاعت کے بے مثل واقعات ظہور میں آئے۔ کافروں کا ایک بڑا سردار عبیدہ بن سعید بن العاص اس روز زرہ بند تھا۔ پورے جسم میں صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کو ابو ذات الکرش کہا جاتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا پیٹ بڑھا ہوا ہو۔ اس نے چیلنج دیا: میں ابو ذات الکرش ہوں۔ ہے کوئی جو میرا مقابلہ کرے؟ چونکہ اُس کے پورے جسم پر لوہے کا لباس منڈھا ہوا تھا، اس لیے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اس کی آنکھوں کا نشانہ لیا۔ اور پوری قوت سے اپنا حربہ، جو ایک چھوٹا سا نیزہ ہوتا ہے، دے مارا۔ حربہ اس کی آنکھوں میں گھس گیا۔ اور وہ واصل جہنم ہُوا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کی آنکھ سے حربہ نکالنے کے لیے بڑا زور لگایا مگر وہ اس کی آنکھ میں بُری طرح دھنسا ہوا تھا، چنانچہ میں اس کے جسم پر چڑھ گیا اور اتنی قوت سے گھما گھما کر حربہ نکالا کہ اس پر دندانے

پڑ گئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے زبیر رضی اللہ عنہ سے مانگ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے واپس لے لیا، پھر ان سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانگ لیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ حربہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مانگ لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد یہ حربہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھرانے کے پاس آ گیا۔ ان سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے مانگ لیا۔ اور یہ ان کی شہادت کے وقت تک ان کے پاس رہا۔ یہ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اتنے ماہر نشانہ باز اور زبردست قوت کے مالک تھے۔ کہ حربہ نہ صرف ٹھیک ٹھیک اپنے ہدف پر مارا بلکہ اتنی قوت سے مارا کہ وہ دشمن کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انھیں زبردست طاقت عطا کی تھی۔ [1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:3998.

54

بدر کے شہداء

غزوۂ بدر مشرکین کی شکست فاش اور مسلمانوں کی فتح مبین پر ختم ہوا۔ مسلمان شہداء کی تعداد چودہ تھی۔ سب سے پہلے شہید ہونے والے مِہجع بن صالح رضی اللہ عنہ تھے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔[1] دنیا والے انھیں غلام سمجھتے تھے۔ مگر مساوات کے حامی، عدل کے داعی، اور اخوت کے بانی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس روز سید الشہداء کا خطاب دیا۔ ارشاد فرمایا: (يَومَئِذٍ مَهْجَعُ سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ) بدر کے شہیدوں کے سردار مِہجع ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت نوازی ہے کہ ایک غلام کو سید الشہداء کا خطاب عطا فرمایا، ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے کمسن بھائی بھی شامل تھے۔ چودہ شہدائے بدر میں چھ مہاجرین اور آٹھ انصار کے اسمائے مبارکہ شامل ہیں۔ مشرکین کے ستر آدمی مارے گئے۔ ان میں مکہ کے بڑے بڑے چوبیس سردار تھے۔ ان کی لاشوں

① دلائل النبوة للبيهقي: 124/3.

کو اللہ کے رسول کے حکم سے بدر کے ایک گندے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ ان مقتولوں میں مکہ کا ایک بڑا سردار عتبہ بن ربیعہ بھی تھا جو ابوسفیان کا سسر اور ہندہ کا والد تھا۔ اس کے ایک بیٹے ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ مسلمان تھے اور جنگ بدر میں مسلمانوں کی طرف سے شریک تھے۔ جب ان کے باپ کو کنویں کی طرف گھسیٹ کر لے جایا جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فرزند حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ غمزدہ تھے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ ارشاد ہوا: ابوحذیفہ! شاید اپنے والد کے سلسلے میں تمھارے دل میں کچھ احساسات ہیں۔ انھوں نے کہا: نہیں اللہ کی قسم! اللہ کے رسول! البتہ میں اپنے باپ کے بارے میں یہ ضرور جانتا تھا کہ ان میں سوجھ بوجھ ہے، دور اندیشی ہے اور صاحبِ عزوشرف ہیں۔ میں آس لگائے بیٹھا تھا کہ عجب نہیں یہ خوبیاں انھیں اسلام تک پہنچا دیں لیکن اب ان کا انجام اور اپنی توقع کے خلاف کفر پر ان کا خاتمہ دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوحذیفہ کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔[1]

[1] البدایۃ والنھایۃ :307/3.

55

اے نافرمانو، سُنو!

بدر کے میدان میں قریش کے مقتولین کی تعداد ستر تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد آپ ﷺ ان کی لاشوں کے پاس کھڑے ہو گئے اور ارشاد فرمایا: تم لوگ اپنے نبی کے لیے کتنا برا کنبہ اور قبیلہ تھے۔ تم نے مجھے جھٹلایا جبکہ اوروں نے میری تصدیق کی۔ تم نے اپنے ہو کر مجھے نکالا جبکہ دوسروں نے مجھے پناہ دی، پھر ان کے بارے میں حکم دیا کہ انھیں گھسیٹ کر کنویں میں ڈال دیا جائے۔ ان میں کفار و مشرکین کے چوبیس بڑے بڑے سردار شامل تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ آپ ﷺ جب کسی قوم پر فتح یاب ہوتے تو تین دن میدان جنگ میں قیام فرماتے تھے، چنانچہ جب بدر میں تیسرا دن آیا تو آپ ﷺ کے حسب حکم آپ ﷺ کی سواری پر کجاوہ کسا گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ پیدل چلے، پیچھے پیچھے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی روانہ ہوئے یہاں تک کہ

آپ ﷺ گندے کنویں کی باڑ پر کھڑے ہو گئے، پھر مقتولین اور سرداران قریش میں سے ایک ایک کا اور اس کے باپ کا نام لے لے کر پکارنا شروع کیا۔ فرمایا: اے فلاں بن فلاں اور اے فلاں بن فلاں! کیا تمھارے لیے یہ اچھی بات نہ تھی کہ تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے؟ کیونکہ ہم سے ہمارے رب نے جو وعدہ فرمایا تھا اسے ہم نے برحق پایا تو کیا تم سے تمھارے رب نے جو وعدہ کیا تھا، تم نے بھی اسے برحق پایا؟ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ایسے جسموں سے باتیں کر رہے ہیں جو بے رُوح لاشیں ہیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے تم سے زیادہ یہ لوگ سن رہے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ تم لوگ ان سے زیادہ سننے والے نہیں۔ بس یہ لوگ جواب نہیں دے سکتے۔[1]

[1] البدایة والنهایة: 305/3، والسیرة النبویة لابن ہشام: 639/2.

کافروں کے ستر آدمی گرفتار ہوئے۔ یہ قیدی بھی عموماً قائد، سردار اور بڑے بڑے سربرآوردہ لوگ تھے۔

مکہ میں شکست کی خبر بالکل غیر یقینی حالت میں سنی گئی۔ سب سے پہلے خبر لے کر حیسُمان بن عبداللہ خزاعی مکہ پہنچا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا: بتاؤ کیا خبر ہے؟ اس نے کہا عتبہ، شیبہ، ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) اور امیہ بن خلف سب قتل کر دیے گئے۔ لوگوں کو اعتبار نہ آیا۔ صفوان بن امیہ کہنے لگا: یہ آدمی ہوش میں نہیں ہے۔ ذرا اس سے میرے بارے میں پوچھو کہ میں کون ہوں۔ لوگوں نے صفوان کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: وہ تو حطیم میں بیٹھا ہوا ہے۔ مگر اللہ کی قسم! اس کے باپ اور بھائی کو میں نے خود قتل ہوتے دیکھا ہے۔ اس غیر متوقع خبر سے مکہ کے کوچہ و بازار میں کہرام برپا ہو گیا[1]

مدینہ میں فتح کی خوش خبری سنانے کے لیے عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہ کو روانہ کیا گیا۔...... اس دوران یہود اور منافقین نے جھوٹے پروپیگنڈے کے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 646/2، والبداية والنهاية: 321/3.

سہارے مدینہ میں ہلچل بپا کر رکھی تھی یہاں تک کہ یہ خبر بھی اڑا دی تھی کہ نعوذ باللہ نبی ﷺ قتل کر دیے گئے ہیں، چنانچہ جب ایک منافق نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ کی اونٹنی قصوا پر سوار آتے دیکھا تو وہ فوراً بول پڑا: واقعی محمد ﷺ قتل کر دیے گئے ہیں۔ دیکھو! یہ انھی کی اونٹنی ہے۔ ہم اسے پہچانتے ہیں اور یہ زید بن حارثہ ہے، شکست کھا کر بھاگا آرہا ہے اور اس قدر مرعوب ہے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے۔ بہر حال جب دونوں قاصد پہنچے تو مسلمانوں نے انھیں گھیر لیا اور ان سے تفصیلات سننے لگے حتیٰ کہ انھیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کو عظیم الشان اور تاریخی فتح حاصل ہوئی ہے۔

فتح کی خبر سے مدینہ میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ در و بام لا الٰہ الا اللہ اور نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھے۔ لوگ اللہ کے رسول ﷺ کو فتح کی مبارک باد دینے کے لیے بدر کے راستے پر چل پڑے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس جب فتح کی خبر پہنچی تو اُس وقت ہم اللہ کے رسول ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ تھیں، دفن کر کے قبر پر مٹی ڈال چکے تھے۔ ان کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول کے حکم سے مدینہ ہی میں رہے اور انھیں بھی مالِ غنیمت سے برابر کا حصہ ملا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بدر میں تین دن قیام فرمایا اور مالِ غنیمت میں سے خمس نکال کر باقی سارا مال مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا۔[1]

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 643/2، والبدایۃ والنھایۃ: 316,317/3.

57

عدل وانصاف کی معراج

بدر کی لڑائی کے لیے جب اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ سے نکلے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے لیے دعا فرمائی :(اَللّٰهُمَّ إِنَّهُمْ جِيَاعٌ فَأَشْبِعْهُمْ، اَللّٰهُمَّ إِنَّهُمْ حُفَاةٌ فَاحْمِلْهُمْ، اَللّٰهُمَّ إِنَّهُمْ عُرَاةٌ فَاكْسُهُمْ) ''اے اللہ! یہ بھوکے ہیں انھیں سیر فرما، یہ پیدل ہیں ان کو سواریاں نصیب فرما، یہ بے لباس ہیں ان کو لباس نصیب فرما۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی دعا قبول فرمالی۔ جب صحابہ کرام بدر سے فاتحانہ واپس آئے تو ہر ایک کے پاس مال غنیمت کا حصہ موجود تھا۔[1] اللہ کے رسول ﷺ کا عدل و انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ وہ لوگ جو اللہ کے رسول ﷺ کے حکم پر مدینہ میں رہے یا جنھیں آپ ﷺ نے بعض معاملات کے لیے روانہ فرمایا تھا اور وہ ان امور کی وجہ سے ہی جنگ میں شریک نہیں ہوئے آپ ﷺ نے انھیں بھی مال غنیمت میں سے

---

① دلائل النبوة للبيهقي: 38/3، سنن أبي داود: 2747.

حصہ مرحمت فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان لوگوں میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں جنھیں مدینہ منورہ کا عامل بنایا گیا تھا۔

سیرت نگاروں نے چار اور افراد کا بھی ذکر کیا ہے جن کو اللہ کے رسول نے مختلف کام سونپ رکھے تھے انھیں بھی مال غنیمت سے حصہ دیا گیا۔ایک بہترین قائد اور اس کی رعیت کے درمیان جس قسم کے تعلقات ہونے چاہئیں اس کی ایک مثال ابوامامہ بن ثعلبہ انصاری کے واقعہ سے ملتی ہے۔ان کی والدہ بیمار تھیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے گھر کے کسی فرد کا گھر پہ رہنا ضروری تھا۔مجاہدین بدر کے لیے نکلے تو ان میں ابوامامہ بھی شامل تھے۔ان سے ان کے ماموں ابو بردہ بن نیار کہنے لگے: تم اپنی والدہ کی دیکھ بھال کے لیے رک جاؤ۔ ابوامامہ نے گزارش کی: ماموں جان! اپنی بہن کی تیمار داری کے لیے آپ کیوں نہیں رک جاتے؟۔سبحان اللہ! کتنا مبارک دور تھا، کیا پیارا ماحول تھا کہ ہر کوئی دوسرے سے بڑھ کر جذبہ جہاد اور شوق شہادت سے سرشار تھا۔ بات اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچ گئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فیصلہ دیا کہ بیٹا اپنی والدہ کے پاس ٹھہرے گا۔

یہاں والدہ کے مقام اور مرتبہ پر بھی غور فرمائیں، حق و باطل کا معرکہ تھا۔ نہایت نازک وقت تھا۔ ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔مگر ابوامامہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی والدہ کی خدمت میں رہیں۔ان کے ماموں ابو بردہ بدر میں شریک ہوئے۔ ابوامامہ کی والدہ اس دوران وفات پا گئیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو

اطلاع ملی۔ واپسی پر اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نماز جنازہ پڑھی۔ اللہ اللہ! ایک ایک ساتھی کی پوری خبر گیری، ان کے رنج و راحت میں شریک رہنے کا بھرپور اہتمام اور فرداً فرداً ہر ساتھی پر اپنی بے لوث محبت نچھاور کرنے کا ایسا بے مثل التزام!...... ہمارے پیارے رہبر حضرت محمد ﷺ کامل معنوں میں قائد انسانیت اور رحمۃ للعالمین تھے۔ [1]

[1] أسد الغابة: 6/15.

58

جنگی مجرم اپنے انجام کو پہنچے

غزوۂ بدر کے قیدیوں میں بڑے بڑے جنگی مجرم بھی شامل تھے۔ قائد لشکر اسلامی ﷺ نے مدینہ طیبہ کے راستہ میں حکم صادر فرمایا کہ نضر بن حارث کو قتل کر دیا جائے۔ بدر میں مشرکین کا جھنڈا اُسی کے پاس تھا۔ یہ بدبخت اسلام دشمنی اور رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی میں پیش پیش رہتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی گردن اڑا دی۔ قارئین کرام! آپ کو وہ بدبخت شخص تو نہ بھولا ہو گا جس نے مکہ مکرمہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی پیٹھ پر نماز کی حالت میں اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی تھی۔ اس بدبخت کا نام عقبہ بن ابی معیط تھا۔ یہ سرکشی اور بغاوت میں سب سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اور بے حد شریر اور بد اخلاق تھا۔ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ بیت اللہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ قریش کا ایک گروہ موجود تھا۔ اونٹ کی اوجھڑی قریب پڑی تھی۔ قریش کے لوگ آپس میں کہنے لگے کہ یہ اوجھڑی اس

کی پیٹھ پر کون ڈالے گا۔ اس بدبخت نے کہا یہ کام میں سرانجام دوں گا۔ اور پھر جب آپ سجدہ میں گئے تو اس عاقبت ناشناس نے یہ اوجھ آپ کی پشت مبارک پر رکھ دی۔ آپ برابر سجدہ کی حالت میں رہے۔ کسی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی۔ وہ بھاگی بھاگی آئیں، فوراً اوجھ اتار دی اور ان شریروں کو برا بھلا کہا۔ ایک مرتبہ اس ملعون نے آپ ﷺ کی گردن پر چادر لپیٹ کر آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہا۔ عین اس وقت تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آ پہنچے۔ انھوں نے اس بدبخت کو زور سے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس بدبخت عقبہ کو بھی قتل کر دیا جائے۔ جب اس نے اپنے قتل کا حکم سُنا تو کہنے لگا اے محمد (ﷺ) میرے بچوں کے لیے کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: آگ۔ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ یا عاصم بن ثابت نے اس کی گردن مار دی۔ جنگی نقطۂ نظر سے ان دونوں ظالموں کو قتل کرنا ضروری تھا کیونکہ یہ صرف جنگی قیدی ہی نہیں تھے بلکہ نہایت خطرناک جنگی مجرم بھی تھے۔ دونوں بے حد شریر، بدفطرت اور بداخلاق تھے۔ کفر و عناد، سرکشی کا مجسمہ تھے۔ ان کی اصلاح کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ یہ ملعون اسلام اور اہل اسلام کی ہجو کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ [1]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: 318/3، والرحیق المختوم، ص: 316,315.

امت محمدیہ کے فرعون کا عبرتناک حشر

بدر کے میدان میں ابوجہل کا جو حشر ہوا اس کے بارے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں لشکر اسلام کی صفوں میں تھا، دائیں طرف دیکھا تو ایک نوعمر لڑکا اور بائیں طرف دیکھا تب بھی ایک نوعمر لڑکا موجود پایا۔ ایک لڑکے نے مجھ سے پوچھا: چچا! ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے کہا: بھتیجے تمھیں ابوجہل سے کیا سروکار؟ اس نے کہا: میں نے سنا ہے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے معلوم ہو جائے تو میں اس کا خاتمہ کر دوں۔ اتنے میں دوسرے نوعمر انصاری لڑکے نے بھی یہی بات کہی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ابوجہل لوگوں کے درمیان چکر لگا رہا ہے۔ میں نے انہیں اشارے سے بتایا کہ وہ ابوجہل کھڑا ہے۔ وہ دونوں اس پر بجلی کی طرح جھپٹ پڑے، معرکہ ختم ہوا۔ امام کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کون ہے جو دیکھے کہ ابوجہل کا انجام کیا ہوا۔ صحابہ روانہ

ہوئے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے اس حالت میں پایا کہ ابھی اُس کا سانس چل رہا تھا۔ انھوں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا اور اس کی ڈاڑھی سے پکڑ کر سر کاٹنے لگے۔ ابوجہل اس جانکنی کے عالم میں بھی رعونت کے مظاہرے سے باز نہ آیا۔ کہنے لگا: او بکری کے چرواہے! تو بڑی اونچی اور کٹھن جگہ پر چڑھ گیا ہے۔ انھوں نے اس کا سر کاٹا اور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ ﷺ نے نعرہ تکبیر لگا کر اللہ کی بڑائی بیان فرمائی۔

بعد میں لاشوں کی پڑتال ہوئی۔ ابوجہل کی لاش گردن کے بغیر تھی، اس لیے پہچانی نہ جاتی تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اس کی لاش تلاش کرو۔ عرض کیا گیا کہ کیا اس کی کوئی نشانی ہے؟ ارشاد فرمایا: ہاں، اس کے گھٹنے میں زخم ہے۔ نوجوانی کے عالم میں ہم دونوں عبداللہ بن جدعان کے دستر خوان پر مدعو تھے۔ وہاں میری اس سے کشتی ہوگئی۔ میں نے اُسے پچھاڑ ڈالا۔ اس موقع پر اس کو زخم لگا تھا، چنانچہ اسی نشانی کی بدولت اس کی لاش کا سُراغ ملا۔[1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3961-3963، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 2/246-248، والبدایۃ والنھایۃ: 3/301،302.

60

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا!

غزوۂ بدر ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے سایے تلے حطیم میں دو شخص بیٹھے تاریخ انسانی کا مکروہ ترین منصوبہ تیار کرنے لگے۔ ان کا مذموم پروگرام یہ بنا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو معاذ اللہ غافل پا کر قتل کر دیا جائے۔ بدر کے میدان میں جو بڑے بڑے سردار واصل جہنم ہوئے، ان میں ایک شخص امیہ بن خلف بھی تھا۔ یہ وہی شخص ہے جو کبھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آقا تھا۔ امیہ ان پر اسلام لانے کی وجہ سے جو ظلم و ستم ڈھاتا تھا، وہ سیرت کے قاری کے لیے مخفی نہیں۔ امیہ کا بیٹا صفوان غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اس کا چچا زاد عمیر بن وہب موجود تھا۔ اس کا بیٹا وہب بدر کے قیدیوں میں ایک تھا اور ابھی تک مدینہ منورہ میں مسلمانوں ہی کی قید میں تھا۔ بدر کی ہزیمت آسانی سے بھلا دی جانے والی چیز نہیں تھی۔ مقتولین کا ذکر کرتے ہوئے صفوان نے کہا: خدا کی

قسم! ان بزرگوں کے دنیا چھوڑ جانے کے بعد اب جینے کا کوئی مزہ نہیں۔ عمیر نے کہا: سچ کہتے ہو۔ اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور یہ خوف نہ ہوتا کہ میرے مرنے کے بعد بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تو میں فوراً مدینہ جا کر شمعِ محمد ﷺ کی یہ روشنی گُل دیتا۔

کیا تم واقعی یہ کارنامہ انجام دے سکتے ہو؟ صفوان نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ عمیر نے جواب دیا: ہاں بالکل! کیوں نہیں؟ بس ادائے قرض اور میرے بچوں کی کفالت کا مسئلہ حائل ہے۔

صفوان بولا: تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہ تو بہت معمولی سی بات ہے۔ میں قرض اور کفالت کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔ بس تم یہ کام کر دو اور ہاں دیکھو! یہ نہایت راز داری سے کرنے کا کام ہے۔ روئے زمین پر اس منصوبے کا میرے اور تمھارے سوا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔

عمیر بولا: بالکل یہ راز راز ہی رہے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اچھا تو پھر ہاتھ ملاؤ اور وعدہ کرو کہ اس بات کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگے گی۔ میں اس منصوبے پر فوری عمل شروع کر رہا ہوں۔ صفوان! تمھیں معلوم ہے کہ میرے پاس مدینہ جانے کا ایک معقول بہانہ بھی ہے۔ میرا بیٹا وہب مسلمانوں کی قید میں ہے۔ اس سے ملاقات کرنے کا بہانہ...... اس نے اپنے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

صفوان گھر آیا۔ اپنی تلوار میان سے نکالی تو ذرا زنگ آلود نظر آئی۔

اس نے اسے خوب تیز کرنے کے بعد زہر میں بجھانا شروع کیا اور زیرلب

بڑبڑایا: آہا!! اب اس تلوار سے میرے باپ کے قتل کا بدلہ لیا جائے گا!

پھر اس نے اپنی زہر میں بجھی تلوار عمیر کے حوالے کر دی اور اسے جلد از جلد مدینہ روانہ ہونے کی تاکید کی۔ عمیر مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا۔ ان دنوں مکہ کی ہر مجلس میں ہر گھر میں بدر ہی کا قصہ موضوع گفتگو تھا۔ صفوان لوگوں سے بڑے اعتماد سے کہتا: بس چند روز کی بات ہے۔ میں ایسی زبردست خبر سناؤں گا کہ تم لوگ بدر کا غم بھول جاؤ گے۔

عمیر بن وہب اپنی چالاکی، سفاکی، شرارت طبع اور بد باطنی کے باعث ''شیطانِ قریش'' کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ مکہ میں اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے صحابہ کو تکلیف دینے میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ بدر کے روز اس کے بیٹے وہب کو ایک انصاری صحابی رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے گرفتار کر لیا تھا۔ عمیر بن وہب مدینہ منورہ پہنچا۔ مسجد نبوی کے سامنے اپنی اونٹنی بٹھائی اور نیچے اترا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ کرام کے ساتھ مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے بدر کی باتیں کر رہے تھے کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں عزت و وقار بخشا اور کفار کو ذلیل و خوار کیا۔ اچانک آپ رضی اللہ عنہ کی نگاہ عمیر پر پڑی جو تلوار لٹکائے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کہنے لگے: ہو نہ ہو اللہ کا یہ دشمن کسی خطرناک ارادے سے یہاں آیا ہے۔ یہ بدر کے روز لوگوں کو جنگ کے لیے بھڑکانے والوں میں پیش پیش تھا۔ اسی نے اندازہ لگا کر کافروں کو مسلمانوں کی تعداد بتائی تھی۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے گلے میں لٹکی ہوئی تلوار کی نیام کی پٹی سے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! یہ دشمن خدا تلوار لٹکائے آ رہا ہے۔ ارشاد ہوا: عمر! اسے چھوڑ دو، آگے آنے دو۔ فاروق اعظم نے صحابہ سے کہا: تم

اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ہی رہنا اور اس خبیث پر نگاہ رکھنا۔ یہ نہایت خطرناک آدمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عمیر میرے قریب آؤ۔ وہ قریب ہو کر جاہلیت کے طریقے کے مطابق کہنے لگا: (أَنْعِمُوا صَبَاحًا) ''آپ لوگوں کی صبح بخیر ہو۔'' (Good Morning) ارشاد ہوا: اللہ تعالیٰ نے ان جاہلانہ الفاظ کے بدلے ہمیں ایک ایسے تحیہ سے مشرف کیا ہے جو تمھارے اس تحیہ سے کہیں بہتر ہے، یعنی سلام سے، جو اہل جنت کا تحیہ ہے۔ ہاں عمیر! بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا: میں اپنے قیدی بیٹے وہب کا حال معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ برائے مہربانی اس کے بارے میں احسان فرما دیجیے۔ فرمایا: یہ تمھارے گلے میں تلوار کیسی لٹک رہی ہے؟ وہ بولا: اللہ ان تلواروں کو غارت کرے انھوں نے ہمیں کیا فائدہ پہنچایا ہے!۔ ارشاد ہوا: عمیر! سچ سچ بتاؤ تم کس مقصد کے لیے آئے ہو؟۔ کہنے لگا: سچ کہتا ہوں، میں صرف اپنے قیدی بیٹے ہی کے لیے آیا ہوں۔

ارشاد ہوا: کیا یہ سچ نہیں کہ تم اور صفوان بن امیہ حطیم میں بیٹھے تھے۔ تم دونوں نے بدر کے کنویں میں پھینکے جانے والے مقتول سرداروں کا تذکرہ کیا، پھر تم نے کہا: اگر مجھے ادائے قرض اور اہل و عیال کی کفالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں مدینہ جا کر محمد (ﷺ) کو قتل کر دیتا۔ اور پھر صفوان بن امیہ نے تمھارا قرض چکانے کی اور تمھارے بچوں کی کفالت کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس شرط پر کہ تم مجھے قتل کر دو۔ یاد رکھو عمیر! اللہ میرے اور تمھارے درمیان حائل ہے۔ عمیر نے یہ سنا تو بے اختیار پکار اٹھا: (أَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ)۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ ہمارے پاس آسمانوں کی جو خبریں لایا کرتے تھے، ہم اُنھیں جھٹلایا کرتے

تھے۔ لیکن یہ معاملہ تو ایسی خفیہ راز داری کا تھا کہ میرے اور صفوان کے علاوہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اللہ کی قسم! مجھے یقین ہے کہ رب کائنات کے علاوہ کسی نے آپ کو یہ بات نہیں پہنچائی۔ اس اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دی۔ علامہ ابن الاثیر کے بیان کے مطابق عمیر بن وہب کے اسلام لانے کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! عمیر بن وہب سے مجھے اس قدر شدید نفرت تھی کہ وہ مجھے خنزیر سے بھی بدتر لگتا تھا مگر اسلام لانے کے بعد یہ مجھے اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیارا لگنے لگا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تحمل اور بردباری ملاحظہ فرمائیے کہ ایسے خطرناک مجرم کو بھی معاف فرما دیا۔ ارشاد ہوا: میرے صحابہ! اپنے اس بھائی کو دین سکھاؤ، اسے قرآن پڑھاؤ اور اس کے قیدی (بیٹے) کو رہا کر دو۔ عمیر اس حسن سلوک کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اب وہ اپنی گذشتہ حرکات پر نادم ہے۔ ان کی تلافی کا خواہش مند ہے۔ عرض کرتا ہے: اللہ کے رسول! میں نے اللہ کے نور کو بجھانے کی بہت کوشش کی، اب اس کا مُداوا کرنا چاہتا ہوں، مجھے مکہ میں رہنے کی اجازت عطا فرمائیں۔ میں اہل مکہ کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کی طرف دعوت دوں گا۔ ان کی یہ درخواست منظور ہوئی، پھر وہ دین حق کے داعی بن کر مکہ میں مقیم رہے اور بہت سے لوگوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ادھر صفوان بے چینی سے اپنی مطلوبہ و پسندیدہ خبر کا منتظر تھا۔ وہ مدینہ سے آنے والے ہر مسافر

سے کسی نئے واقعہ کے بارے میں پوچھتا تھا۔ ایک دن اسے کسی سوار نے بتایا: صفوان! تمھارے لیے خبر یہ ہے کہ عمیر مسلمان ہو گیا ہے۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی، اس نے قسم کھائی کہ وہ عمیر سے ساری زندگی کلام کرے گا نہ اس کے کسی کام آئے گا۔[1]

[1] الکامل في التاریخ لابن الأثیر: 2/ 31,30، والبدایۃ والنھایۃ: 3/ 327,326، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 2/ 272-274.

61

بدر والو! تمہارے لیے جنت کا فیصلہ ہو چکا

اسی طرح ایک بدری صحابی حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک سنگین غلطی کر بیٹھے
اتفاق یہ ہوا کہ انھی دنوں بنو عبدالمطلب کی ایک لونڈی سارہ مدینہ آئی ہوئی تھی۔
حاطب کے اہل وعیال مکہ میں تھے۔ انھوں نے قریش کے نام خط لکھ دیا۔ اس میں
انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ پر حملے کی تیاری کا ذکر بھی کر دیا۔ اس
عورت نے اس خط کو اپنے سر کے بالوں میں چھپایا اور مکہ چل دی۔ اللہ کے رسول
کو بذریعہ وحی اس بات کا علم ہو گیا۔

آپ نے حضرت علی، حضرت مقداد، حضرت زبیر اور حضرت ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہم
کو یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ روضہ خاخ پہنچو۔ وہاں ایک ہودج نشین عورت ملے گی۔
اُس کے پاس قریش کے نام ایک رقعہ ہوگا یہ اس سے وصول کرو۔ یہ حضرات
گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو وہی عورت موجود تھی۔

اس سے کہا: نیچے اُتر آؤ۔ پوچھا: کیا تمھارے پاس کوئی خط ہے؟ اس نے کہا: میرے پاس کوئی خط نہیں۔ انھوں نے اس کے کجاوے کی تلاشی لی۔ لیکن کچھ نہ ملا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کہا ہے نہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ تم فوراً خط نکال دو، ورنہ ہم تمھیں ننگا کر دیں گے۔ جب اس نے یہ پختگی دیکھی تو بولی: اچھا منہ پھیرو۔ انھوں نے منہ پھیرا تو اس نے چوٹی کھول کر خط نکالا اور ان کے حوالے کر دیا۔ یہ لوگ خط لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ دیکھا تو اس میں تحریر تھا: (حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے قریش کی جانب)، پھر قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر دی گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کو بلا کر پوچھا: حاطب! یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے خلاف جلدی نہ فرمائیں۔ اللہ کی قسم! اللہ اور اس کے رسول پر میرا ایمان کامل ہے۔ میں مرتد ہوا ہوں نہ مجھ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں خود قریش کا آدمی نہیں، البتہ میں انھی کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ میرے بال بچے وہیں ہیں لیکن قریش سے میری کوئی قرابت نہیں کہ وہ میرے بال بچوں کی حفاظت کریں ...... اس کے برعکس جو دوسرے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں وہاں ان کے قرابت دار موجود ہیں جو ان کی حفاظت کریں گے چونکہ اس طرح کا کوئی سہارا مجھے حاصل نہیں، اس لیے میں نے چاہا کہ ان پر ایک احسان کر دوں

جس کے عوض وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی ہے اور یہ منافق ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! دیکھو! یہ جنگِ بدر میں حاضر ہو چکا ہے۔ تمھیں کیا معلوم؟ غالباً اللہ نے اہلِ بدر پر جھانک کر کہا: تم لوگ جو چاہو کرو، میں نے تمھیں بخش دیا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور انھوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ [1]

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3007، 398.

منافقِ اعظم کی دوغلی باتیں

عبداللہ بن ابی کا تعلق انصار کے قبیلے خزرج سے تھا۔ یہ مدینہ میں اسلام کی شعاعیں پہنچنے سے پہلے کی بات ہے کہ اسے اوس اور خزرج کا متفقہ سردار بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ دونوں قبیلوں کی سربرآوردہ شخصیات کی مدد سے اس کی تاجپوشی کے لیے مونگوں کا تاج بنایا جا رہا تھا کہ اسی دوران مدینہ میں اسلام کی روشنی پھیل گئی۔ اسلام کی تجلیاں اتنی تیزی سے مدینہ میں چمکیں کہ لوگوں کی توجہ عبداللہ کی تاجپوشی سے ہٹ گئی اور سب کی توجہ اسلام اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف ہو گئی۔ یوں عبداللہ بن ابی کی بادشاہت کے خواب ٹوٹ گئے۔ اس وجہ سے وہ اسلام کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا سب سے بڑا دشمن بن گیا۔[1] اس نے غزوۂ بدر کے بعد بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ محض دکھلاوا تھا۔ اندر سے اس کا باطن خباثت اور تعفن سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اسلام اور اللہ کے رسول کی اہانت کا کوئی موقع

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام 200/2، وتفسير ابن كثير: 153/4.

ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا، اس کے اظہار اسلام سے پہلے ایک بار اللہ کے رسول ﷺ گدھے پر سوار ہو کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے پیچھے اسامہ بن زید بن حارثہ کو بٹھا لیا۔ یہی اسامہ بتاتے ہیں کہ راستے میں ایک جگہ عبداللہ بن ابی مجلس جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے گرد قبیلے کے کچھ لوگ جمع تھے۔ سرور عالم (ﷺ) کا گزر ہوا تو اسے برا لگا اور اس نے منہ پھیر لیا۔ حضور ﷺ قریب پہنچے سلام کیا، تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ قرآن کریم کا کچھ حصہ پڑھا اور اللہ کی طرف دعوت دی۔ اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں اور اس کے غضب سے ڈرایا۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی دم سادھے بیٹھا رہا اس نے کوئی بات نہیں کی لیکن جب نبی کریم ﷺ فارغ ہو کر چلنے لگے تو وہ بڑے گستاخانہ اور بازاری انداز میں منہ پھاڑ کے بولا: ''اے فلاں!...... تیرا یہ بات کرنے کا ڈھنگ ٹھیک نہیں...... اپنے گھر بیٹھ جو کوئی تیرے پاس جائے بس اس کو اپنی بات سنا دیا کر...... اور جو تیرے پاس نہ آئے اسے تنگ نہ کیا کر اور اس کے گھر میں آ کر ایسی دعوت نہ سنا کہ جو اسے ناگوار ہو۔''

...... اس کے جملوں پر غور فرمائیے۔ اُس کے ایک ایک لفظ سے زہر ٹپک رہا ہے اور حرف حرف سے سڑاند اٹھ رہی ہے۔ کتنے دل چھیدنے والے بول ہیں اور کیسے اشتعال دلانے والے کینہ بھرے جذبات ہیں۔

درحقیقت یہ عبداللہ بن ابی نہیں بول رہا تھا۔ یہ جاہلیت کا مٹتا ہوا دور تھا جو آنے والے دور امن و عافیت کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

اس مجلس میں عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ ان کی غیرت نے اپنا رنگ دکھایا۔ انھوں نے اس منافق اعظم کو تنک کر جواب دیا۔ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں نہ آئیں۔ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھروں اور ہماری مجلسوں میں آئیں گے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سر بلندی عطا فرمائی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے سے ہدایت عطا کی ہے۔''[1]

یہ اظہارِ اسلام سے پہلے کی بات ہے۔ جنگ بدر کے بعد جب اس نے ہوا کا رخ دیکھ کر اسلام کا اظہار کیا تب بھی اندر ہی اندر وہ اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کا دشمن ہی بنا رہا اور اسلامی معاشرے میں انتشار برپا کرنے اور اسلام کی آواز کمزور کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ وہ اعدائے اسلام سے بڑا گہرا اور مخلصانہ ربط رکھتا تھا، چنانچہ وہ بنو قینقاع کے معاملے میں نہایت نامعقول طریقے سے دخل انداز ہوا۔ اسی طرح اس نے غزوۂ احد میں بھی شر پھیلانے، بدعہدی کرنے اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے، ان کی صفوں میں بے چینی، انتشار اور کھلبلی پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کی۔

اس منافق کے مکر و فریب کا یہ عالم تھا کہ اپنے ظاہری اسلام کے بعد ہر جمعہ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے تشریف لاتے تھے تو یہ پہلے خود کھڑا ہو جاتا اور کہتا: ''لوگو! یہ تمھارے درمیان اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ نے ان کے ذریعے تمھیں عزت و احترام بخشا ہے، لہٰذا ان کی مدد کرو، انھیں قوت پہنچاؤ۔ ان کی بات سنو اور مانو۔'' اس کے بعد وہ بیٹھ جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر

خطبہ دیتے تھے۔ اس کی ڈھٹائی اور بے حیائی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب جنگ احد کے بعد پہلا جمعہ آیا...... یہ شخص اس جنگ میں اپنی بدترین دغا بازی کے باوجود خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہی کھڑا ہوگیا اور وہی باتیں دہرانی شروع کیں جو اس سے پہلے کہا کرتا تھا لیکن اب مسلمانوں نے مختلف اطراف سے اس کا لباس پکڑ لیا اور کہا: او اللہ کے دشمن! بیٹھ جا۔ تو نے جو جو حرکتیں کی ہیں، ان کے بعد اب تو اس لائق نہیں رہ گیا کہ اس مقدس منبر پر چڑھ کر لب کشائی کرے۔ اس پر وہ جھلا گیا۔ لوگوں کی گردنیں پھلانگتا اور یہ جُملہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا کہ میں تو ان صاحب کی تائید کے لیے اٹھا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کوئی مجرمانہ بات کہہ دی ہے۔ اتفاق سے دروازے پر ایک انصاری سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے کہا: تیری بربادی ہو۔ واپس چل! رسول اللہ ﷺ تیرے لیے دعائے مغفرت کردیں گے۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے لیے دعائے مغفرت کریں۔[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 4/152،151، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 3/117،116.

63

غزوۂ سویق

مسجد نبوی کے باب ملک فہد سے باہر نکلیں اور سامنے شمال کی طرف دیکھیں تو ایک سرخ رنگ کا پہاڑی سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو کئی مربع میل تک پھیلا ہوا ہے، اسے احد کہا جاتا ہے۔ اس پہاڑ کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس پہاڑ کے دامن میں مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان بہت بڑی جنگ ہوئی جسے تاریخ نے غزوۂ احد کے نام سے محفوظ کیا ہے۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ احد کی وجہ تسمیہ عموماً یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس علاقے میں یہ پہاڑ واقع ہے، وہاں دوسرے پہاڑوں کے درمیان یہ اپنی جگہ سب سے تنہا، سب سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے، اسی لیے اس علاقے کے لوگ اسے احد کہتے ہیں۔ بعد میں یہ سارا پہاڑی علاقہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ غزوۂ احد ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینہ میں وقوع

پذیر ہوا۔ غزوۂ بدر میں قریش مکہ کو جو رسوائی اور پسپائی ہوئی اور جس شکست فاش سے وہ دو چار ہوئے وہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔ حتی کہ کفار مکہ نے پہلے پہل اس خبر کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا۔ مکہ میں شکست کی خبر سب سے پہلے حیسمان بن عبداللہ خزاعی نے پہنچائی، لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے اور بدر کا حال پوچھنے لگے۔ اس نے بتایا کہ عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ، زمعہ، ابوالبختری سب مارے گئے۔ امیہ کا بیٹا صفوان کہنے لگا کہ یہ شخص بدحواسی کے عالم میں ہے۔ ذرا اس سے میرے بارے میں پوچھو کہ میں کون ہوں اور میرا کیا حال ہے۔ لوگوں نے اس سے صفوان کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا: صفوان تو حطیم میں بیٹھا ہے مگر واللہ! میں نے اس کے والد امیہ اور اس کے بھائی کی لاشوں کو مقتولین میں دیکھا ہے۔ شکست کی تصدیق ہوگئی تو خواتین نے غم کے مارے بال نوچ لیے، گھوڑوں اور اونٹوں کی کونچیں کاٹ دی گئیں۔ کفار قریش نے اپنے مقتولین پر نوحہ اور بین کیا۔ اور پھر انہوں نے سوچا کہ نوحے اور بین کی خبریں مسلمانوں کو معلوم ہوں گی تو وہ خوش ہوں گے، لہٰذا رونے اور نوحہ کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق ایسے وقت رونے پر پابندی پسماندگان کے لیے عذاب الٰہی میں اضافہ تھا، کیونکہ میت پر رونے سے غمزدہ کے دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔ ادھر غزوۂ بدر کے بعد قریش کی قیادت وسیادت ابوسفیان کے ہاتھ آ گئی۔ اس نے منت مانی کہ جب تک وہ بدر کا بدلہ نہ لے لے گا غسل جنابت نہ کرے گا۔

اپنی قسم پوری کرنے کے لیے وہ دو سو قریشی سواروں کو لے کر روانہ ہوا اور مدینہ

طیبہ سے قریباً بارہ میل کے فاصلے پر ٹھہرا، پھر رات کی تاریکی میں وہ بنو نضیر کے محلّہ میں گیا۔ اور حُیی بن اخطب کے دروازے پر دستک دی اس نے ڈر کے مارے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ بنو نضیر کے رئیس اور خزانچی سلام بن مشکم کے پاس پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا، مرحبا کہا، ابوسفیان کی خوب خاطر تواضع کی اور اسے بعض مخفی راز بتائے۔ ابوسفیان رات ہی کو اپنے لشکر میں واپس آ گیا۔ اس نے رات کے پچھلے پہر ایک دستہ بھیج کر مدینہ سے تین میل (پانچ کلو میٹر قریبا) کے فاصلے پر ایک مقام ''عُریض'' پر حملہ کروا دیا۔ ان لوگوں نے ایک انصاری سعد بن عمرو اور اس کے ایک حلیف کو جو سعد کے کھیت میں موجود تھا قتل کیا، چند مکانات' کھجور کے درخت اور گھاس کے انبار جلا دیے ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہو گئی۔ اللہ کے رسول ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے صحابہ کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ ابوسفیان بھاگا۔ وہ زادراہ کے طور پر جو ستو کے بورے اور سامان لے کر آیا تھا اسے گھبراہٹ میں اور بوجھ ہلکا کرنے کے لیے راستے میں پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اس لیے یہ واقعہ ''غزوۂ سویق'' کے نام سے مشہور ہوا۔[1]

[1] البدایۃ والنہایۃ: 355,321/3، والسیرۃ النبویۃ: 50/3۔

64

ایک موذی سانپ کا خاتمہ

قباء اب مدینہ منورہ کا حصہ ہے۔ مسجد قباء کے محراب سے بائیں طرف ایک چھوٹی سی سڑک جنوب سے اوپر کی طرف جاتی ہے۔ کم و بیش دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کریں تو آپ کو دائیں جانب پرانے قلعے کے آثار نظر آئیں گے۔ یہ قلعہ کعب بن اشرف کا تھا۔ غزوہ بدر کے بعد یہاں ایک عظیم واقعہ پیش آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کی تفصیل بیان کریں پہلے کعب بن اشرف کے بارے میں بتاتے چلیں کہ یہ کون تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ طے کی شاخ بنونبہان سے تھا۔ اس کے باپ اشرف نے زمانۂ جاہلیت میں کسی کو اچانک قتل کر دیا اور بھاگ کر مدینہ آ گیا۔ یہاں وہ بنی نضیر کے یہود کا حلیف ہی نہیں بلکہ ان کا داماد بھی بن گیا۔ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام کعب رکھا گیا۔ یہ بڑا ہوا تو بہت خوبصورت نکلا۔ وہ نامور شاعر تھا، نہایت مالدار تھا۔ ایک بڑے قلعہ میں رہتا تھا، جس کا ذکر اوپر گزرا۔ یہ

ان یہودیوں میں سے تھا جو اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ سخت عداوت اور دشمنی رکھتے تھے۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کو ذہنی اذیت پہنچایا کرتا تھا اور آپ ﷺ کے خلاف جنگ کی کھلم کھلا دعوت دیتا پھرتا تھا۔ بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی تو اُسے بڑا جھٹکا لگا۔ مارے حسد کے رہ نہ سکا، بے اختیار کہنے لگا: کیا سچ مچ ایسا ہوا ہے کہ بڑے بڑے سردار قتل ہو گئے ہیں۔ یہ عرب کے اشراف اور لوگوں کے بادشاہ تھے۔ اگر محمد نے ان کو مار دیا ہے تو ہم لوگوں کے لیے روئے زمین کا شکم اس کی پشت سے کہیں بہتر ہے۔

اس نے مشرکین کی غیرت کو بھڑکانے اور ان کی آتش انتقام کو تیز تر کرنے کے لیے اشعار کہے، پھر مکہ جا پہنچا اور سرداران قریش کو مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔ وہ جگہ جگہ مختلف مجلسوں میں بیٹھتا اور اپنے خبث باطن کا اظہار کرتا۔ اس کے انتقام کی آگ بھڑکتی ہی جارہی تھی، سرد ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایک دن ابوسفیان نے اس سے پوچھا: ذرا یہ تو بتاؤ کہ محمد کا دین اللہ کو زیادہ پسند ہے یا ہمارا دین؟ وہ کہنے لگا کہ تم لوگ ان سے زیادہ ہدایت یافتہ اور افضل ہو۔ جب قریش انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے تو یہ مدینہ واپس آیا۔ اور بڑھ چڑھ کر پہلے سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی عورتوں کے خلاف گندے اشعار کہنے شروع کیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ہجو کرنا اس کی عادت رذیلہ بن چکی تھی۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ام الفضل رضی اللہ عنہا کے بارے میں اس نے نہایت اشتعال انگیز اشعار کہے۔

کعب کے جرائم کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ پاک دامن، عفیفات، قانتات، عابدات صحابیات پر الزام تراشی، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکانا اور پھر خود رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لغو باتیں کرنا اس امر کا متقاضی تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ شخص بڑا با اثر اور دولت مند تھا۔ اور اپنے نوکروں چاکروں سمیت رہتا تھا۔ صحیح بخاری اور سیرت کی بہت سی کتابوں میں اس کے قتل کا واقعہ بڑی تفصیل سے مذکور ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: کون ہے جو کعب بن اشرف سے نمٹے؟ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بڑی ایذا پہنچائی ہے۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ کیا آپ کی خواہش ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے؟ فرمایا: ہاں۔ عرض کرنے لگے: کیا مجھے اس امر کی اجازت ہے کہ آپ کے بارے میں کوئی ناگوار بات کہہ سکوں۔ ارشاد ہوا: اجازت ہے۔ محمد بن مسلمہ کعب بن اشرف کے پاس گئے۔ گفتگو شروع ہوئی تو اللہ کے رسول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ اس شخص نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا ہے، ہم سے صدقہ طلب کرتا رہتا ہے۔ اب ہم مشقت میں مبتلا ہیں۔ میں تمھارے پاس کچھ قرضہ لینے آیا ہوں۔ ایسا کرو کہ ایک یا دو وسق غلہ دے دو۔ کعب کہنے لگا: آگے آگے دیکھتے جاؤ۔ ابھی تم محمد سے اور زیادہ اکتا جاؤ گے۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اب جبکہ ہم ان کے پیروکار بن چکے ہیں تو مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ آپ ہمیں غلہ دیں تاکہ ہماری مشکل دور ہو سکے۔ کعب کہنے لگا: درست ہے مگر اس کے لیے تمھیں میرے

پاس کچھ رہن رکھنا ہوگا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں ٹھیک ہے مگر کونسی چیز رکھیں؟

کعب کی خباثت پر غور فرمائیں! کہنے لگا: اپنی عورتیں میرے پاس گروی رکھ دو۔ محمد بن مسلمہ کہنے لگے: کوئی کرنے والی بات کرو، تم عرب کے سب سے خوبصورت آدمی ہو اور ہم اپنی عورتیں تمھارے پاس رہن رکھ دیں؟۔ وہ کہنے لگا: کوئی بات نہیں، پھر اپنے بیٹے ہی رہن رکھ دو۔ جواب ملا: یہ تو ان کے لیے گالی بن جائے گی کہ ایک دو وسق غلہ کے بدلے انھیں رہن رکھا گیا تھا۔ یہ ہمارے لیے بڑے عار کی بات ہے، البتہ ہم تمھارے پاس اپنا اسلحہ رکھ سکتے ہیں۔ اس پر اس نے ہاں کہہ دی، چنانچہ ان دونوں میں اسلحہ رہن رکھنے پر اتفاق ہو گیا۔ ادھر کعب کے قتل کے لیے پانچ افراد کا انتخاب ہوا۔ قیادت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے اور باقی سب اس مشن کے ارکان تھے۔ ان میں ابو نائلہ بھی تھے جو کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے۔ وہ اس کے پاس گئے، کچھ شعر و شاعری کی، کچھ گفتگو کی اور پھر بڑی رازداری سے وہی باتیں کہیں جو محمد بن مسلمہ نے کہیں تھیں۔ دوران گفتگو ابو نائلہ کہنے لگے: میرے کچھ اور بھی ساتھی ہیں، اُن کے خیالات مجھ سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ان پر بھی احسان کریں۔ ابو نائلہ اور محمد بن مسلمہ اپنی اپنی گفتگو کے ذریعے اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ کیونکہ اب ان کے لیے اسلحہ اور رفقاء سمیت کعب بن اشرف تک رسائی اور اسے ٹھکانے لگانے کی راہ ہموار ہو گئی اور ان کی آمد پر کعب بن اشرف کے چونکنے اور کسی طرح کے شک وشبہے میں پڑنے کا کوئی کھٹکا باقی نہ رہا۔

ایک موذی سانپ کا خاتمہ

یہ 14 ربیع الاول تین ہجری کی ایک چاندنی رات تھی۔ پانچ افراد پر مشتمل یہ دستہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ بقیع الغرقد تک ان کے ساتھ چلے۔ ان کو دعائیں دیں کہ اللہ کا نام لے کر جاؤ۔ اللہ تمھاری مدد فرمائے، پھر آپ ﷺ ساری رات ان کے لیے دعائیں کرتے اور نماز و مناجات میں مشغول رہے۔ دراصل کسی بھی مہم کے لیے ظاہری اسباب اختیار کر لینے کے بعد سب سے اہم چیز بارگاہ الٰہی میں خشوع و خضوع سے دعا ہوتی ہے۔

یہ دستہ جب کعب بن اشرف کے قلعے کے دامن میں پہنچا تو ابو نائلہ نے کعب کو قدرے زور سے آواز دی۔ آواز سن کر وہ ان کے پاس آنے کے لیے اٹھا، اس کی بیوی جو نئی نویلی دلہن تھی، کہنے لگی: اس وقت کہاں جا رہے ہو؟۔ میں ایسی آواز سن رہی ہوں جس سے خون چھلک رہا ہے۔

کعب نے کہا: یہ محمد بن مسلمہ اور میرا دودھ شریک بھائی ابو نائلہ ہے۔ عزت دار آدمی کو اگر نیزے کی مار کی طرف بھی بلایا جائے تو وہ اس پکار پر بھی لبیک کہتا ہے۔ کعب باہر آیا۔ اس کے سر سے خوشبو کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔ ابو نائلہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہہ رکھا تھا کہ جب یہ شخص آئے گا تو میں اس کے بال سونگھوں گا۔ پھر جونہی میں اس کے سر پر قابو پا لوں تو تم اس کا کام تمام کر دینا۔ کعب آیا، باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک ابو نائلہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: کعب! کیوں نہ ہم شِعب عجوز تک چلیں۔ کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔ وہ چہک کر بولا: چلو چلتے ہیں۔ ابو نائلہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: کعب تمھارے جسم سے کیسی عمدہ خوشبو آ رہی ہے۔

ایسی مہک تو میں نے کبھی نہیں سونگھی۔ کعب نے نہایت فخر سے سینہ تان کر کہا کہ میرے پاس عرب کی سب سے زیادہ خوشبو والی عورت ہے۔ ابو نائلہ نے کہا: اگر اجازت ہو تو میں تمھارا سر سونگھ لوں۔ کہنے لگا: ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ابو نائلہ نے خود بھی اس کا سر سونگھا اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے بھی سونگھا۔ اور اس کی مہک کی تعریف کی۔ تھوڑی دور آگے چلے تو ابو نائلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بھئی مزا آ گیا۔ کیا لاجواب خوشبو ہے۔ کیا ایک مرتبہ پھر سونگھ سکتا ہوں؟ کعب نے پھر اپنا سر آگے بڑھا دیا۔ تھوڑی دُور آگے جا کر ابو نائلہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بھئی ایک بار اور۔ اس نے اپنا سر ابو نائلہ کے ہاتھوں میں دے دیا۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، جب خوب قابو پا لیا تو فوراً صدا لگائی: لے لو اللہ کے اس دشمن کو۔ چشم زدن میں بیک وقت کئی تلواریں چمکیں اور کعب کے بدن میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پھٹکا بھی نہ کھانے پایا۔ تیورا کر گر پڑا۔ اُس کے سانس کی رفتار بے قابو ہو گئی۔ ابھی جان باقی تھی۔ اب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنی کدال سے آخری وار کیا اور اسے واصل جہنم کر دیا۔ کعب نے اس زور کی چیخ ماری کہ گرد و پیش ہلچل مچ گئی۔ قلعے میں آگ روشن کی گئی مگر اُسے بچانے کے لیے کوئی آگے نہ بڑھا۔ کعب کا سر اتار کر دستہ نے واپسی کی راہ لی۔ بقیع میں پہنچ کر زور کا نعرۂ تکبیر لگایا۔ اللہ کے رسول ﷺ کو بھی خبر ہو گئی۔ آپ ﷺ نے بھی اللہ اکبر کہا۔ جب یہ مجاہدین آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا (أَفْلَحَتِ الْوُجُوهُ) یہ چہرے کامیاب رہیں۔ جواب میں عرض کیا گیا: (وَوَجْهُكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ) اللہ کے رسول ﷺ آپ کا

چہرہ انور بھی (کامیاب وشاداب رہے)۔

شاتم رسول ﷺ اور اسلام کے بدترین دشمن کا سر آپ کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔ آپ ﷺ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان فرمائی۔ اس کارروائی کے دوران دستہ کے ایک سپاہی حضرت حارث بن اوس رضی اللہ عنہ کو بعض ساتھیوں کی تلوار کی نوک لگ گئی تھی۔ جس سے وہ زخمی ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان کے زخم پر اپنا لعاب دہن لگایا جس سے تکلیف جاتی رہی۔ وہ مکمل شفا یاب ہو گئے اور آئندہ ان کو کبھی تکلیف نہ ہوئی۔[1]

---

[1] صحيح البخاري، حديث 4037، وفتح الباري: 7/421-424، والبداية والنهاية: 4/8-10.

65

امام المرسلین ﷺ کی دوستوں سے بے تکلفی

وہ بنو اشجع سے تعلق رکھتا تھا، نام زاہر بن حرام تھا، مدینہ منورہ سے باہر کا رہنے والا یہ دیہاتی لمبے قد کاٹھ کا تھا۔ رنگ گندمی تھا۔ صحابی ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ یہ محبت یک طرفہ نہ تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب یہ مدینہ منورہ آتا تو آتے وقت اللہ کے رسول ﷺ کے لیے کچھ دیہی سوغاتیں اپنے ساتھ لاتا۔ ستو، شہد، تازہ سبزیاں، تازہ فروٹ وغیرہ جو کچھ اس کے علاقے میں میسر ہوتا وہ اسے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ جب وہ واپس جانے لگتا تھا تو اللہ کے رسول ﷺ اس کو شہری سوغاتیں تحفہ میں عطا فرماتے تھے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا تھا کہ ایک دن اللہ کے رسول نے اسے ایک اعزاز سے نوازا جو غالباً کسی دوسرے صحابی کے حصہ میں نہیں آیا۔ ارشاد ہوا کہ زاہر ہمارا دیہی دوست ہے

اور ہم اس کے شہری دوست ہیں۔

زاہر دیہاتی لوگوں کی طرح جب بھی شہر آتا تو اپنا سامان لے کر بازار میں کھڑا ہو جاتا۔ یہ منظر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جب کوئی دیہاتی سامان لے کر شہر آتا ہے تو شہری لوگ آناً فاناً اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں تاکہ تازہ سبزیاں اور پھل وغیرہ خرید سکیں۔ ایک مرتبہ زاہر اپنے ساتھ بہت سی دیہی سوغاتیں لے کر مدینہ کے بازار میں آیا۔ ادھر سے اچانک اللہ کے رسول ﷺ بھی اسی بازار میں تشریف لے آئے، دیکھا کہ ان کا دیہاتی دوست کھڑا چیزیں فروخت کر رہا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ آگے بڑھے اور پیچھے سے جا کر اس کی آنکھوں پر اپنے مبارک ہاتھ رکھ دیے۔ قارئین کرام! ذرا غور فرمائیے! یہ کیسی مُخلصانہ، کتنی بے لوث اور کس قدر بے تکلف محبت کا مظاہرہ ہے، ٹھیک اُسی طرح کا مظاہرہ جو ہمارے ہاں بھی پایا جاتا ہے، یعنی کسی خاص دوست کو دیکھ کر بے تکلف احباب اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام کے ساتھ نبی رحمت ﷺ کا برتاؤ کتنا مخلصانہ، مشفقانہ اور کریمانہ تھا۔ اسی قابلِ رشک پیار کا مظاہرہ زاہر کے ساتھ ہوا۔ اس نے اچانک اپنی آنکھوں پر کسی کے ہاتھ محسوس کیے تو قدرے پریشان ہوا اور کہنے لگا کہ یہ کون ہے؟ کس نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہیں؟ اور پھر اس نے ہاتھوں کی نزاکت اور نوازش سے اندازہ کر لیا۔ اس نے اللہ کے رسول ﷺ کی خوشبو سونگھ لی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ پیچھے کتنی بڑی شخصیت کھڑی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا

اپنی پشت کو اللہ کے رسول ﷺ کے سینے سے ملنا شروع کر دیا۔ ادھر اللہ کے رسول ﷺ نے محبت و مرحمت کے لہجے میں حاضرین سے فرمایا: لوگو! کون ہے جو اس غلام کو خریدے؟ اس نے جواب میں کہا: اللہ کے رسول مجھ جیسے کالے بھجنگ دیہاتی کو خرید کر کوئی کیا کرے گا۔ یہ تو سراسر گھاٹے کا سودا ہوگا۔ ارشاد ہوا: میرے دوست! ایسا نہ کہو۔ تمھیں کس نے کہا کہ تمھاری کوئی قدر و قیمت نہیں۔ تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والے ہو۔ تم اللہ کے ہاں نہایت قیمتی ہو۔[1]

---

[1] مسند أحمد: 3/161، وصحیح ابن حبان (الإحسان)، حدیث: 5760.

سرفروشوں کا ترانہ

یہ ہجرت کے پانچویں سال کی بات ہے۔ مدینہ طیبہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کے باسیوں کی کل تعداد، جوان، بوڑھے، بچے، عورتیں اور بچیاں سب ملا کر پانچ ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ اس بستی کو مٹانے کے لیے قریش اتنی بڑی فوج لے کر آئے جس کا اُس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس ننھی سی بستی کو ختم کرنے کے لیے دشمن دس ہزار جنگجوؤں کا لشکر لے آیا۔ یہودی اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ بنونضیر کے بیس سردار مکے میں قریش کے پاس وفد کی شکل میں پہنچے اور انھیں اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ کے لیے بھڑکاتے ہوئے اپنی مدد کا یقین دلایا۔ قریش نے ان کی بات مان لی، پھر یہ وفد بنو غطفان کے پاس پہنچا۔ انھیں بھی حرب وضرب پر بھڑکایا۔ وہ بھی تیار ہو گئے، پھر تو یہ وفد چرخی کی

طرح بقیہ قبائل عرب میں گھوم گھوم کر لوگوں کو جنگ پر اکسانے لگا۔ بہت سارے لوگ تیار ہو گئے۔ جنوب سے ابوسفیان نے چار ہزار جنگجوؤں کا لشکر لے کر مدینہ کا رخ کیا۔ مرّ الظہران پہنچا تو بنوسلیم بھی شامل ہو گئے۔ مشرق سے غطفانی قبائل اوران کے نجدی ہم سفر چھ ہزار کی نفری لے کر آ گئے۔ مدینہ کی قیادت ہمیشہ سے بیدار مغز، چوکنا اور چوکس تھی۔ اس کی انگلیاں ہمیشہ حالات کی نبض پر رہتی تھیں۔ خود احتسابی کا عمل ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ حالات وحوادث کا صحیح صحیح تجزیہ کیا جاتا تھا۔ اور ہر طرح کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے مناسب ترین قدم اٹھایا جاتا تھا۔ مخبروں نے کفار کے عزائم اور نقل وحرکت سے مطلع کیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے بلا تاخیر مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب فرمایا۔

صحابہ سے مشورہ ہوا۔ جنگی پلان کی نوک پلک پر تبادلۂ خیال ہوا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔ حق کا یہ متلاشی ہزاروں میل کی مسافتیں طے کرتا ہوا مدینہ پہنچا تھا۔ یہ نہایت مخلص اور ذہین وفطین شخصیت تھے اُنھوں نے موقع محل کا جائزہ لیا اور ایک جہاندیدہ جرنیل کی طرح خندق کھودنے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ مدینہ کی بستی تین اطراف سے حروں یعنی لاوے کی چٹانوں اور کھجور کے باغوں کی اوٹ میں ہے لہٰذا دشمن صرف شمال کی جانب سے حملہ کرسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اِس دفاعی منصوبے کی تائید فرمائی۔

چنانچہ شمال کی جانب خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ ہر دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ خندق کھودنے کا کام سونپا گیا۔ یہاں کوئی بڑا تھا نہ چھوٹا، تمام مجاہدین

یکساں طور پر نہایت جوش و خروش سے خندق کھود رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رجز پڑھتے جاتے تھے۔ خود اسلامی سپاہ کے سالار اعلیٰ ﷺ اپنے مبارک ہاتھوں سے مٹی ڈھو رہے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ بڑی محبت سے فرما رہے تھے۔

اللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَهْ

فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَهْ

''اے اللہ! یقیناً زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ پس انصار و مہاجرین کو بخش دے۔''

اور جواب میں انصار و مہاجرین یہ زمزمۂ محبت و فدویت گنگنا رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

''ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے تا حیات محمد ﷺ سے جہاد پر بیعت کر لی ہے۔ ہم اس عہد پر زندگی کے آخری لمحے تک قائم رہیں گے''[1]۔

---

[1] صحيح البخاري، حديث:4099،4098، وصحيح مسلم، حديث:1805،1804، والرحيق المختوم،ص:407-409.

67

ایمان ویقین اور عزم وعمل کی نرالی شان

غزوۂ خندق میں کفر اپنی پوری قوت سمیٹ کر کے مدینہ آرہا تھا تاکہ مدینہ کو ملیا میٹ کر دے۔اہل ایمان کی یہ ننھی سی بستی بھی اہلِ باطل کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔ اللہ اللہ! کیا منظر تھا کہ چند حق پرستوں کو مِٹانے کے لیے دس ہزار کا شمشیر بکف جتھا اُمنڈ آیا۔ اور چاروں طرف ہیبت بار خطرات کے بادل منڈلا رہے تھے...... ادھر اللہ کے رسول ﷺ نہایت اطمینان سے میدان جہاد میں مصروفِ عمل تھے۔آپ ﷺ کو بارگاہ الٰہی سے خوشخبریاں دی جارہی تھیں اور خندق مسلسل کھودی جارہی تھی اچانک راستے میں ایک بڑا پتھر آ گیا اسے توڑنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ کدالیں جواب دے گئی تھیں آپ ﷺ کو اس دُشواری سے آگاہ کیا گیا۔ آپ نے فوراً کدال لی اور بسم اللہ پڑھ کر پتھر پر ماری ۔فضا میں ایک خوفناک چمک کوندنے لگی۔ارشاد ہوا:

اللہ اکبر! مجھے ملک شام کی کنجیاں دی گئی ہیں واللہ! میں اس وقت وہاں کے

سرخ محلات کو دیکھ رہا ہوں، پھر دوسری ضرب لگائی تو سخت پتھر کا ایک دوسرا ٹکڑا کٹ گیا، فرمایا اللہ اکبر! مجھے فارس دیا گیا ہے، واللہ! میں اس وقت مدائن کا سفید محل دیکھ رہا ہوں، پھر اللہ کا نام لے کر تیسری ضرب لگائی تو باقی ماندہ چٹان بھی کٹ گئی، پھر فرمایا: اللہ اکبر! مجھے یمن کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ واللہ! میں اس وقت یہاں سے صنعاء کے پھاٹک دیکھ رہا ہوں۔ ادھر منافقوں کی یہ حالت تھی کہ ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارے کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ہمارے پاس کھانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ہے اور یہ ہمیں قیصر و کسریٰ کے محلات کی فتح کی خوشخبری دے رہے ہیں۔ سورۂ احزاب: ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے اسی صورتحال کا ذکر فرمایا ہے:

﴿ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ﴾

''اس وقت منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، کہنے لگے: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے محض دھوکے اور فریب کے وعدے کیے تھے۔''[1]

قارئین کرام! ذرا غور فرمائیے۔ اس پیشین گوئی پر صرف 25 سال گزرے تھے کہ ظالم وجابر کسریٰ کا خاتمہ ہو گیا۔ کیا اللہ کے رسول ﷺ کی خوشخبریاں معاذ اللہ دھوکا تھیں؟ کیا یہ جھوٹ تھا؟ ہرگز نہیں، آپ ﷺ کے ارشادات حرف بحرف درست تھے۔ آپ ﷺ کے فرامین ایک ایک کر کے پورے ہو کر رہے۔

[1] الأحزاب 12:33، دیکھیے: الرحیق المختوم، ص: 412,411، وسبل الهدیٰ والرشاد: 4/ 367.

68

جابر کی دعوت

خندق کی کھدائی کے دوران کوئی بھاری پتھر آڑے آجاتا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے سالارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کرتے۔ آپ نے بھوک کی شدت کے باعث پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی حالتِ گرسنگی میں اپنی کدال کی ضرب کاری سے فولاد جیسی چٹان توڑ کر رکھ دیتے تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھوک دیکھی تو تڑپ اُٹھے۔ سیدھے گھر تشریف لے گئے۔ بیوی سے کہا: کیا گھر میں کوئی کھانے پینے کی چیز ہے؟۔ اس نے کہا: بکری کا ایک سال سے بھی کم عمر کا بچہ اور ایک صاع جَو ہیں۔ انھوں نے فوراً بکری کا بچہ ذبح کیا۔ ادھر بیوی نے جَو پیس کر آٹا گوندھا۔

اب حضرت جابر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چپکے چپکے عرض کیا کہ بہ نفسِ نفیس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دو ساتھی کھانے کے لیے تشریف لے چلیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی جابر رضی اللہ عنہ کی بات سنی تو اہل

خندق سے مخاطب ہو کر اعلان فرمایا: (يَأيها النَّاس! إنَّ جَابِرًا صَنَعَ لَكُمْ طَعَاماً فهيَّا هَلَا بِكُمْ) ''لوگو! جابر نے تمھاری دعوت کی ہے۔ آؤ آؤ ہم سب کھانے کے لیے چلیں۔''

صحابہ کرام سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ مسلسل کئی دنوں کے بھوکے مہاجر اور انصار ذوقِ جہاد کی سرشاری میں خندق کھود رہے تھے۔ انھوں نے دعوت کا سنا تو فورًا جابر رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ ان کے آگے آگے ان کے امام، مربی اور محسن تھے اور اپنی شدید بھوک کے باوجود دوسروں کے لیے ایثار کرنے والے جابر رضی اللہ عنہ کے گھر جا رہے تھے۔

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اُس وقت مجھے بڑی سخت شرم آ رہی تھی۔ میں رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ کھانا تو محض چند افراد کے لائق ہے اور اِدھر سینکڑوں حضرات میرے گھر کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ اب میں اتنی کثیر تعداد کے مہمانوں کا انتظام کس طرح کرسکوں گا۔ میں اسی پریشانی میں جلدی جلدی گھر پہنچا۔ بیوی کو سارا ماجرا سنایا۔ وہ نہایت ذہین اور سمجھ دار خاتون تھی۔ کہنے لگی: ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دعوت دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان ہی سے کہا تھا نا!۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام۔ ادھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جابر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچ گئے۔ دریافت فرمایا: جابر وہ گوشت کہاں ہے؟۔ عرض کیا: وہ ہنڈیا میں رکھا ہے۔ پھر ارشاد ہوا: آٹا کہاں ہے؟۔ عرض کیا: یہ رہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!......اب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے۔ بسم اللہ پڑھ کر اپنا مبارک لعاب دہن ہانڈی میں ڈالا'

اوپر سے ڈھکنے پر آٹا لگایا اور تاکید فرمائی کہ ڈھکنا نہ اٹھانا۔ پھر فرمایا: آٹے کو کپڑے سے ڈھانپ دو اور روٹیاں پکاتے چلے جاؤ...... بعدازاں مجھے حکم دیا:

...... جابر! دس دس کی تعداد میں اپنے ساتھیوں کو کھانے کے لیے بلاتے جاؤ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم دس دس کی تعداد میں داخل ہوتے، سیر ہو کر کھانا کھاتے پھر دوسروں کے لیے جگہ خالی کر کے واپس چلے جاتے۔ اِدھر ضیافت فرمانے والے اللہ کے رسول ﷺ اسی طرح باری باری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بٹھاتے اور کھانا کھلاتے رہے۔ اس طرح تمام انصار و مہاجرین کھانا کھا کر فارغ ہو گئے مگر ہنڈیا کے اندر گوشت بدستور اسی طرح موجود تھا۔ کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آٹا بھی اسی طرح برقرار تھا۔ یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا۔ اللہ کی طرف سے خاص مدد تھی۔ اور اپنے مؤمنین پر خاص رحمت تھی...... آخر میں جناب رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا: جابر اب اپنے اہل خانہ کے ساتھ مل کر کھانا کھالو اور پڑوسیوں کو بھی بھیجو۔ وہ کہتے ہیں: میں قریب ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے رُوئے تاباں کی طرف دیکھا تو آپ ﷺ مسکرا رہے تھے اور فرما رہے تھے: (أَشْهَدُ أَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ) ''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں'' ادھر میں بھی سرشار ہو کر پکار اُٹھا: (وَأَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ) ''میں بھی گواہی دیتا ہوں ہوں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔

جابر کہتے ہیں: پھر ہم نے اپنے ہمسایوں کو بھی گوشت اور روٹیاں بھجوائیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ہمارے ہمسایوں نے بھی اس رات خوب گوشت خوری کی اور روٹی کے مزے لیے۔ [1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4101، ورحمة للعالمين لعائض القرني، ص:196-198.

ہم لاشوں کی قیمت نہیں کھاتے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پورے جوش وخروش اور عزم و ہمت سے خندق کی کھدائی میں حصہ لیا۔ خندق تیار ہوگئی۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ جگہوں پر پہنچایا گیا۔ ان کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا۔ ادھر ابوسفیان اپنی فوجیں لے کر آ گیا۔ بنوقریظہ کے یہود بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ اور غطفانی قبائل بھی اپنے خیمے نصب کر رہے تھے۔ ابوسفیان نے دیکھا کہ سامنے خندق ہے۔ عرب اس ہتھیار سے ناواقف تھے۔ اس نے دو تین مرتبہ خندق پار کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ خندق کے دوسری جانب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی حفاظت پر مامور تھے تاکہ کوئی خندق پار نہ کر سکے۔ بڑی تگ ودو کے بعد مشرکین کے بعض شہسوار عمرو بن عبدوُد، عکرمہ بن ابی جہل اور ضرار بن خطاب وغیرہ خندق کو پار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عمرو بن عبدود نے دعوت مبارزت دے دی۔ یہ پچاس سال کا تجربہ کار پہلوان تھا۔

اسے اپنی بہادری پر بڑا غرور تھا۔وہ بار بار چیلنج دے رہا تھا کہ کون ہے جو میرا مقابلہ کرے؟ ادھر اسلام کے شیر، اللہ کے رسول ﷺ کے چچا زاد اور داماد سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس کی طرف لپکے۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ یہ پیدل تھے۔ ان کی عمر 27 سال ہے۔ اُسے للکارا۔ اس نے پوچھا تم کون ہو؟ جواب ملا: میں ہوں علی بن ابی طالب۔ اس نے کہا: اچھا ابطح کے شیخ، یعنی ابو طالب کے بیٹے مگر تم تو ابھی نوجوان ہو، میں تمھارا خون بہانا نہیں چاہتا۔ کسی اور کو بھیجو۔ جواب ملا (لَكِنِّي وَاللّٰهِ لا أكرهُ أنْ أهَرِيقَ دَمَكَ) ''لیکن اللہ کی قسم! مجھے تو تمھارا خون بہانے میں کوئی تردد نہیں۔''

یہ سُنتے ہی وہ آگ بگولا ہوگیا۔ گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور نیچے اتر آیا۔ گھوڑے کی کوچیں کاٹ دیں۔ پھر اس کے چہرے پر بھی مارا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دوبدو آ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جسم پر زرہ تھی۔ دونوں بڑے مانے ہوئے بہادر شمشیرزن تھے۔ معاً ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ افق پر غبار چھا گیا۔ مسلمانوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے فضا گونج اُٹھی۔ ادھر مشرکین نے ھبل کے نعرے بلند کیے۔ منظر گرد و غبار سے پوری طرح اٹ گیا۔ادھر اللہ کے رسول ﷺ اللہ کے حضور اسلام کے اس عظیم شہسوار کی فتح کے لیے دعا فرما رہے ہیں: اے اللہ! یہ صرف تیری رضا کے لیے میدان میں نکلا ہے۔ یہ تیرے کلمہ لا الہ الا اللہ کے جھنڈے کو اونچا کرنے کے لیے ابن عبدوُد کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اس کی مدد فرما۔ تھوڑی ہی دیر میں گرد و غبار چھٹ گیا۔ لوگوں نے دیکھا اور اللہ کے رسول ﷺ نے بھی مشاہدہ فرمایا کہ: ابوالحسن علی بن ابی طالب مشرک کے سینے پر

بیٹھے اسے یوں ذبح کر رہے ہیں جیسے بکری ذبح کی جاتی ہے۔ اللہ کے رسول اللہ اکبر! کہہ رہے ہیں اور اللہ سے التجا کر رہے ہیں کہ مدینہ منورہ کے اس محاصرے کو ختم فرما دے۔

باقی مشرکین مرعوب ہو کر بھاگ گئے اور خندق کے پار جا نکلے۔ بلکہ عکرمہ بن ابی جہل تو بدحواسی میں اپنا نیزہ بھی چھوڑ گیا۔

امام ابن کثیر نے البدایہ والنھایہ میں لکھا ہے کہ ابن عبدوُد کی لاش تڑپ کر خندق میں جا گری۔ ابن ہشام کے حوالے سے وہ بیان کرتے ہیں کہ مشرکین نے عمرو بن عبدوُد کی لاش لینے کے لیے دس ہزار دینار کی پیش کش کی لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے جواباً فرمایا: ہم ...... مردہ فروش نہیں ...... ہم لاشوں کی قیمت نہیں کھاتے، یہ ہمارے لیے جائز نہیں۔ اس خبیث لاش کو بلا قیمت ہی لے جاؤ۔[1]

---

[1] البدایۃ والنھایۃ (ملخصًا): 4/107،108.

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کی بہادری

غزوۂ خندق میں کفر کا ساتھ دینے میں بنوقریظہ بھی شریک تھے۔ ہر چند انھوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ جنگ کی حالت میں وہ نہ صرف مسلمانوں کا ساتھ دیں گے بلکہ ان کا دفاع بھی کریں گے۔ وہ نہ صرف عہد شکنی کے مرتکب ہوئے بلکہ عملی طور پر جارحانہ جنگی کاروائیوں میں بھی مصروف ہو گئے۔ مسلمان خواتین حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے فارع نامی قلعے کے اندر جمع تھیں۔ ان خواتین میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی سیدہ صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ ایک یہودی قلعہ کا چکر لگانے لگا۔ قلعہ میں سوائے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے کوئی مرد نہ تھا۔ حضرت صفیہ نے خیمے کے ستون کی ایک لکڑی لی اور قلعے سے اتر کر اس یہودی کے پاس پہنچیں اور لکڑی سے مار مار کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سیدہ صفیہ بنت عبدالمطلب دوسری عورتوں اور بچوں کے ساتھ جناب حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مکان کی چھت پر تشریف فرما تھیں جبکہ خود

حسان بن ثابت اللہ کے رسول کے ارشاد کے مطابق ان سب کی نگرانی پر مامور تھے۔ شام کا جھٹ پٹا ہو چلا تھا کہ سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا نے جناب حسان رضی اللہ عنہ سے کہا: ذرا دیکھیے تو سہی اُدھر ایک شخص چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، پھر خود ہی کہنے لگیں کہ وہ شخص تو مجھے کوئی یہودی معلوم ہوتا ہے۔ جناب حسان رضی اللہ عنہ چونک کر بولے:

ٹھہریے! میں دیکھتا ہوں...... مگر اتنے میں وہ خود ہی اس طرف جھپٹ پڑیں جہاں اب کسی مرد کا سر چھت کی منڈیر سے ابھر رہا تھا۔ محترمہ نے ایک موٹا ڈنڈا اس ابھرتے ہوئے سر پر اس طرح رسید کیا کہ وہ شخص ایک لمبی دلخراش چیخ مار کر چھت کی منڈیر سے نیچے جا پڑا۔ جناب حسان رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ کر بولے: ارے محترمہ! آپ نے تو کمال کر دیا۔ حضرت صفیہ نے کہا وہ شخص یقیناً مر چکا ہو گا کیونکہ وہ مرد تھا، اس لیے میں اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی، لہٰذا آپ نیچے جائیے اور اس کی لاش اوپر لے آئیے۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ اس کی لاش اوپر اٹھا لائے۔ غور سے دیکھا گیا تو وہ واقعی مدینے کا ایک یہودی نکلا۔ وہ عورتوں اور بچوں کو خوف زدہ کر کے مسلمانوں کی جنگ سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔[1] بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ زیادہ بہادر نہیں تھے۔ اس لیے مردِ میدان نہ تھے۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو انھیں عورتوں کی حفاظت پر مامور نہ کیا جاتا۔ انھوں نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے اس حیرت انگیز کارنامے پر ان کی مدح میں متعدد اشعار بھی کہے تھے۔[2]

---

① السیرة النبویة لابن ہشام: 239/3.

② الروض الأنف: 433,432/3.

71

جب کفر کی ہوا اکھڑ گئی

موسم شدید سرد تھا رات کے اندھیرے اُتر آئے تھے۔ بڑی تاریک اور سرد رات تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو پکارا اور دریافت فرمایا: کون ہے جو دشمن کی خبر لے کر آئے؟ تمام لوگ خاموش ہیں۔ سامنے موت نظر آ رہی ہے۔ بھوک، خوف اور شدید سردی! ...... پھر ارشاد ہوا (مَنْ يَذْهَبُ وَهُوَ رَفِيقِي فِي الْجَنَّةِ) ''جو دشمن کی خبر لے کر آئے وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔''

ذرا اس زبردست انعام پر غور فرمائیں کہ جنت کا وعدہ ہے۔ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا (مَنْ يَذْهَبُ وَهُوَ رَفِيقِي فِي الْجَنَّةِ) صحابہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے نام لے کر فرمایا: حذیفہ رضی اللہ عنہ! اٹھو، تم جاؤ۔ اب سوچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ جب میں نے رسالت مآب ﷺ کی لسان حق ترجمان سے اپنا نام سنا تو میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

آپ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ جان کا خوف، خطرہ طرح طرح کے اندیشے اور سردی کوئی بھی چیز حائل نہ رہی۔ یہ نہایت تاریک رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں خندق میں اترا۔ نہایت خاموشی سے دوسری طرف مشرکین کے کیمپ میں پہنچ گیا اور قریش کے ساتھ جا بیٹھا۔ ابوسفیان اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا آگ تاپ رہا تھا یہ کمانڈر انچیف اور اتحادی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ غطفان، قریظہ اور قریش سبھی اسی کی کمان میں جمع تھے۔ ابوسفیان عرب کا مانا ہوا مدبر اور نہایت ذہین فرد تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: اے میری قوم کے لوگو! اس شدید آندھی کی زد میں آکر ہماری ہانڈیاں الٹ گئی ہیں۔ خیمے اکھڑ گئے ہیں۔ ان حالات میں مجھے اندیشہ ہے کہ محمد ﷺ نے یقیناً اپنے کسی جاسوس کو ہمارے بارے میں معلومات لینے کے لیے بھیجا ہوگا، لہٰذا تم سب اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ اور پوچھو کہ اس کے ساتھ کون بیٹھا ہے؟۔

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بھی نہایت ذہین و فطین شخص تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کا انتخاب سوچ سمجھ کر ہی کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابوسفیان کی بات سن کر میں نے سوچا: اگر میرے ساتھ والے نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم کون ہو تو بھلا کیا جواب دوں گا؟ اس لیے میں نے پہل کرتے ہوئے اپنے دائیں طرف والے آدمی سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا: معاویہ بن ابی سفیان، پھر میں نے دوسری جانب بیٹھے شخص کا ہاتھ پکڑا اور پوچھا: تم کون ہو؟ وہ بولا: عمرو بن العاص۔ ظاہر ہے کہ اب ان سے دائیں بائیں پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ دشمن اب واپسی

کی تیاریاں کر رہا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دشمن کا خوب جائزہ لیا۔ جو ڈیوٹی انھیں سونپی گئی تھی اسے پورا کیا اور واپس چل پڑے۔ اس دوران انھیں ایسا موقع میسر آیا کہ ابوسفیان ان کے تیر کے نشانے پر تھا۔ ارادہ بھی کیا مگر پھر اللہ کے رسول کا ارشاد یاد آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: صرف ان کی خبر لے کر آنا اور کسی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔ اس واقعے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قائد نے جس کام کا حکم دیا ہے صرف اسی کی تعمیل کی۔ اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ حذیفہ واپس پہنچے۔ شدید سردی سے کانپ رہے ہیں۔ ادھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حضور سر بسجود ہیں۔ مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ اپنے سالار اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے اور رپورٹ پیش کی۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر کا ایک حصہ حذیفہ رضی اللہ عنہ پر ڈال دیا۔ تاکہ سردی سے بچاؤ کر سکیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ اسی جگہ چادر لیے سو جاتے ہیں۔ حتی کہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت محبت بھرے انداز میں انھیں نماز کے لیے بیدار کیا۔ بلاشبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں سے نہایت رحیمانہ اور کریمانہ برتاؤ فرماتے تھے۔[1]

---

[1] سبل الھدیٰ والرشاد: 389,388/4، ورحمۃ للعالمین لعائض القرنی، ص: 204-206، وصحیح مسلم، حدیث: 1788.

72

کھجوروں میں برکت

ابن ہشام کے حوالہ سے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ بشیر بن سعد کی بیٹی اور مشہور صحابی نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ بیان کرتی ہیں: میری والدہ عمرہ بنت رواحہ نے مجھے ایک پوٹلی میں تھوڑی سی کھجوریں دیں اور کہا: اسے اپنے والد اور ماموں عبداللہ بن رواحہ کے پاس لے جاؤ۔ جب میں اپنے والد اور ماموں کو تلاش کرتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: بیٹی تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟۔ میں نے عرض کیا: یہ میری والدہ کی دی ہوئی کھجوریں ہیں۔ میں انھیں اپنے باپ اور ماموں کو دینا چاہتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کھجوریں میرے پاس لاؤ۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر وہ کھجوریں رکھ دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر لانے کا حکم دیا۔ چادر پیش کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کھجوریں بکھیر دیں، پھر ایک شخص کو حکم دیا کہ

اہل خندق کو دعوت دے دو کہ دو پہر کے کھانے کے لیے آ جائیں۔ اہلِ خندق آ گئے۔ وہ کھاتے گئے اور کھجوریں بڑھتی گئیں حتی کہ چادر کے کناروں سے باہر گرنے لگیں۔

یہ واقعہ جہاں اللہ کے رسول ﷺ کا معجزہ تھا وہاں اس سے ایک مسلمان خاتون کی جہاد میں عملاً شرکت کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ بھوک کی وجہ سے صحابۂ کرام بلکہ خود اللہ کے رسول ﷺ نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے۔ اس عالم میں ایک مسلمان خاتون مسلمانوں کے لیے طعام کا بندوبست کر رہی تھی۔[1]

[1] السیرة النبویة لابن ہشام: 3/228، 229 والبدایة والنہایة: 4/99.

خندق کی لڑائی کے دوران بنو غطفان کی ایک نمایاں شخصیت نعیم بن مسعود مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ابھی ان کے اسلام کا کسی کو علم نہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اکیلے کیا کر سکتے ہو؟ ہاں! کافروں کی حوصلہ شکنی کرو اور ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرو۔ یہ فوراً بنو قریظہ کے ہاں پہنچے۔ پرانے تعلقات تھے۔ اپنی محبت اور تعلقات کا حوالہ دیا اور ان سے کہا کہ تم لوگوں نے قریش اور بنو غطفان کا ساتھ دے کر اچھا نہیں کیا۔ یہ لوگ باہر سے آئے ہیں جنگ کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ مگر تمھارا گھر بار، بیوی بچے مدینہ ہی میں ہیں، پھر تم لوگ ہو گے اور محمد ﷺ ہوں گے۔ وہ جیسے چاہیں گے تم لوگوں سے انتقام لیں گے۔ ان کی بات سن کر وہ لوگ چونک پڑے۔ کہنے لگے واقعی ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ آپ ہی بتائیں ہمیں اب کیا کرنا

چاہیے۔انھوں نے کہا کہ جب تک قریش تم لوگوں کو اپنے کچھ آدمی یرغمال کے طور پر نہ دیں۔تم ان کے ساتھ جنگ میں شرکت نہ کرو۔قریظہ نے کہا کہ آپ نے مناسب رائے دی ہے۔اس کے فوراً بعد حضرت نعیم سیدھے قریش کے پاس پہنچے۔ان سے بھی ان کے تعلقات تھے۔بات چیت ہوئی، انھیں اعتماد میں لیا۔ پھر کہا: یہود نے محمد ﷺ اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو عہد شکنی کی ہے اس پر وہ نادم ہیں۔اب ان میں یہ مراسلت ہوئی ہے کہ وہ (یہود) آپ لوگوں سے کچھ آدمی بطور یرغمال حاصل کر کے مسلمانوں کے حوالے کریں گے اور پھر آپ لوگوں کے خلاف محمد سے اپنا معاملہ ٹھیک کر لیں گے، لہٰذا اگر وہ یرغمال طلب کریں تو ہرگز نہ دینا۔قبیلہ بنو غطفان تو ان کا اپنا قبیلہ تھا ان کی اس سے بھی اسی قسم کی گفتگو ہو گئی۔اگلے روز قریش نے یہود کو پیغام بھیجا کہ محاصرے کو خاصا وقت گزر چکا ہے۔گھوڑے اور اونٹ مر رہے ہیں، لہٰذا اِدھر سے آپ اُدھر سے ہم اچانک اٹھیں اور اکٹھے حملہ کریں اور اس جنگ کو نمٹا دیں۔یہ جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب تھی۔اگلے روز ہفتہ تھا۔یہودیوں کا مقدس دن جس میں ان کے لیے لڑائی جائز نہ تھی۔انھوں نے اس روز لڑائی سے انکار کیا اور قاصد سے کہہ دیا کہ جب تک قریش ہمیں کچھ آدمی بطور یرغمال نہ دیں ہم لڑائی میں شریک نہ ہوں گے۔قاصد واپس گیا تو قریش اور بنو غطفان نے کہا: واللہ! نعیم نے سچ ہی کہا تھا۔انھوں نے یہود کو پیغام بھیجا کہ ہم تمھیں ہرگز کوئی آدمی نہیں دیں گے۔تم فوراً ہمارے ساتھ مل کر محمد ﷺ پر ہلہ بول دو۔قریظہ کے لوگوں نے کہا: نعیم سچ کہتا تھا۔دونوں

فریقوں کا ایک دوسرے پر اعتماد ختم ہو گیا۔ افواہوں نے جنم لیا۔ حوصلے پست ہو گئے۔ اللہ کی غیبی مدد آ گئی ۔ادھر مسلمان اللہ کے رسول کے ساتھ مل کر دعائیں مانگنے لگے:

(اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ سَرِيعَ الْحِسَابِ اِهْزِمِ الْأَحْزَابَ اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ)

''اے اللہ! کتاب نازل کرنے والے اور جلد حساب لینے والے۔ ان لشکروں کو شکست دے۔ اے اللہ! انھیں ہرا دے اور جھنجھوڑ کر رکھ دے۔''

مشرکین کی صفوں میں پھوٹ پڑنے کے بعد بددلی پھیل گئی۔ ہمتیں پچک گئیں اب اللہ تعالیٰ نے ان پر تند ہواؤں کا طوفان بھیج دیا۔ خیمے اکھڑ گئے، ہانڈیاں الٹ گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فرشتوں کے ذریعے سے مدد فرمائی اور لشکر باطل کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(اَلْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَا نَحْنُ نَسِيرُ إِلَيْهِمْ)

''اب ہم (اس جنگ کے بعد) ان پر چڑھائی کریں گے۔ وہ ہم پر چڑھائی نہ کر سکیں گے۔ اب ہمارا لشکر ہی ان کی طرف پیش قدمی کرے گا۔'' [1]

---

[1] السیرة النبویة لابن ہشام: 3/241-243، والبدایة والنھایة: 4/113-155، صحیح البخاري، حدیث: 4110، 7489.

کیا خوب جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

غزوۂ خندق میں دست بدست اور خونریز جنگ کی نوبت نہ آسکی تھی۔ چونکہ دونوں فوجوں کے درمیان خندق حائل تھی، اس لیے صرف تیراندازی ہوتی رہی۔ فریقین کے سولہ 16 افراد بھی قتل ہوئے۔ ان میں چھ مسلمان اور دس مشرک تھے۔ تیراندازی کے دوران حبان بن عرقہ نامی ایک قریشی مشرک کا تیر انصار کے ایک بڑے سردار سعد بن معاذ کے بازو پر لگا۔ اس سے ان کے بازو کی رگ کٹ گئی۔ زخم زیادہ بڑا نہ تھا، تاہم انھوں نے ایک عجیب وغریب دعا فرمائی ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ جس قوم نے تیرے نبی ﷺ کی تکذیب کی اور انھیں مکہ سے نکال باہر کیا۔ اس قوم سے جہاد کرنا مجھے جس قدر محبوب ہے اتنا کسی اور قوم سے نہیں۔ اے اللہ! میں سمجھتا ہوں کہ اب تو نے ہماری اور ان کی جنگ کو آخری مرحلہ تک پہنچا دیا ہے۔ اگر قریش کی جنگ کچھ باقی رہ گئی ہے تو مجھے اس کے لیے باقی رکھ کہ

میں ان سے تیری راہ میں جہاد کر سکوں اور اگر تو نے لڑائی ختم کر دی ہے تو اس زخم کو جاری کر کے اسے میری موت کا سبب بنا دے۔ چونکہ اس جنگ میں بنو قریظہ نے مسلمانوں سے کھلم کھلا غداری کی تھی، اس لیے دعا کے آخری الفاظ یوں تھے ''اے میرے اللہ! مجھے اُسی وقت موت آئے جب بنو قریظہ کے انجام کے بارے میں میری آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو جائے۔'' حضرت سعد بن معاذ اس وفد میں شامل تھے جنھوں نے دوران جنگ بنو قریظہ سے مذاکرات کیے تھے۔ اور ان کو ان کی بدعہدی سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ یہود کا کردار ہمیشہ سے منافقانہ رہا ہے۔ جب ان پر مشکل وقت آتا ہے تو منت سماجت پر اتر آتے ہیں اور معمولی سی بھی ڈھیل مل جائے تو اپنی روایتی خباثت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

حضرت سعد بن معاذ چونکہ زخمی تھے، اس لیے ان کو علاج کے لیے رُفیدہ کے خیمے میں منتقل کر دیا گیا۔ ابن ہشام کے مطابق رفیدہ اسلمیہ انصاریہ خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کیا کرتی تھیں۔ ان کا تعلق قبیلہ بنو اسلم سے تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کی خواہش تھی کہ سعد بن معاذ کی تیمارداری قریب سے فرما سکیں، اس لیے ان کا خیمہ مسجد ہی میں لگا دیا گیا۔ جہاں ان کا علاج شروع ہوا۔

اوپر ان کی دعا کا ذکر ہوا ہے۔ ان کی دعا قبول ہو گئی۔ زخم بتدریج بہتر ہوتا چلا گیا، تاہم وہ بدستور زیرِ علاج رہے۔

قبیلہ اوس کی شاخ بنو عبد الاشہل سے تعلق رکھنے والے سعد اپنی قوم کے بڑے معتبر اور محبوب رہنما تھے۔ غزوہ بنی قریظہ میں جب یہودیوں نے اپنے آپ کو اللہ

کے رسول ﷺ کے سپرد کر دیا تو حکم ہوا کہ ان کے مردوں کے ہاتھ باندھ دیے جائیں، چنانچہ محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں ان کے ہاتھ باندھ دیے گئے۔ مردوں اور عورتوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ قبیلہ اوس کے لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ عرض کیا کہ بنوقریظہ کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو آپ نے بنوقینقاع کے ساتھ فرمایا تھا۔ یہ لوگ خزرج کے حلیف تھے اور بنوقریظہ ہمارے، یعنی اوس کے حلیف ہیں، لہٰذا ان پر احسان فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تمھارے قبیلے کا فرد ہی اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ انھوں نے کہا: بڑی عمدہ بات ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب یہ معاملہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حوالے ہے۔ اوس کے لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا کہ ہم اس پر راضی ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے سعد بن معاذ کو بلوا بھیجا۔ وہ خیمے میں زیر علاج تھے۔ انھیں وہاں سے ایک گدھے پر سوار کر کے لایا گیا۔ راستے میں اوس کے لوگوں نے اُن سے بنوقریظہ سے ہمدردی اور اچھے سلوک کی درخواست کی اور کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کو حکم ہی اس لیے دیا ہے کہ آپ ان سے حسن سلوک کریں۔ مگر وہ چپ تھے۔ جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: اب وقت آ گیا ہے کہ سعد کو اللہ کے بارے میں کسی کی پروا نہ ہو۔ جب سعد اللہ کے رسول ﷺ کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (قُومُوا إِلٰى سَيِّدِكُمْ)۔ ''اٹھو! اپنے سردار کو سواری سے اتار کر لے آؤ''۔

اب انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میرا فیصلہ تمام لوگوں یعنی مسلمانوں اور یہودیوں سمیت سب پر نافذ ہوگا؟ ارشاد ہوا: سب پر نافذ ہوگا۔ تو انھوں نے بے دھڑک کہا: میرا فیصلہ یہ ہے کہ بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے اور اموال تقسیم کر دیے جائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ فیصلہ سن کر فرمایا کہ تم نے وہی فیصلہ کیا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔

حضرت سعد بن معاذ کا یہ فیصلہ یقیناً حق اور انصاف پر مبنی تھا۔ بنو قریظہ نے بد عہدی اور غداری کر کے مسلمانوں کو شکست دلوانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ انھوں نے اتنے نازک وقت میں مسلمانوں کو دھوکا دیا تھا جب وہ زندگی اور موت کی آزمائش سے دو چار تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں سے معاہدہ توڑا بلکہ انھیں قتل کرنے کے لیے مشرکین کو ڈیڑھ ہزار تلواریں، دو ہزار نیزے، تین سو زرہیں اور پانچ سو ڈھالیں بھی فراہم کر دی تھیں۔ بنو قریظہ کی اسلام کے ساتھ دشمنی کی انتہا تھی کہ انھوں نے غزوۂ خندق کے دوران نہتی عورتوں کے قلعہ کے بھی چکر کاٹنے شروع کیے۔ مقصد عورتوں اور بچوں کو پریشان کر کے لشکر اسلامی کی توجہ محاذ جنگ سے ہٹانا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ ﷺ کی شیر دل پھوپھی سیدہ صفیہ بنت عبدالمطلب کی ہمت اور طاقت کام آئی۔ آخر وہ عبدالمطلب جیسے قوی اور بہادر سردار کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے ایک یہودی کو قتل کر کے ان کی سازش ناکام بنا دی۔ ان کے اس بے باک کارنامے کا بڑا گہرا اور اچھا اثر پڑا۔ یہود نے

اس کارروائی سے غالباً یہی سمجھا کہ ان قلعوں میں بھی مسلمانوں کا حفاظتی لشکر موجود ہے۔ اس لیے یہود کو دوبارہ اس قسم کی جرأت نہ ہوئی حالانکہ وہاں مسلمانوں کا کوئی لشکر نہ تھا، یہودی بت پرست حملہ آوروں کے ساتھ اپنی یک جہتی کا عملی ثبوت دیتے ہوئے انھیں مسلسل رسد پہنچاتے رہے حتیٰ کہ مسلمانوں نے ان کی رسد کے بیس اونٹوں پر قبضہ بھی کر لیا۔

جب یہودیوں کی عہد شکنی کی خبر کی تصدیق کے لیے ایک وفد ان کے پاس گیا تو ارکانِ وفد نے انھیں خباثت پر آمادہ پایا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کو علانیہ گالیاں بکیں، دشمن کی طرف داری کی، اللہ کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کی۔ ذرا ان کے الفاظ پر غور فرمائیں۔ یہ لوگ وفد کے ارکان سے کہنے لگے کہ کون اللہ کا رسول......؟ ہمارے اور محمد کے درمیان کوئی عہد ہے نہ پیمان۔ ان کی اس قسم کی گفتگو اور پروپیگنڈے سے منافقین نے بطور خاص حوصلہ پایا۔ انھوں نے اس مشکل گھڑی میں اپنا نفاق ظاہر کر دیا۔ کہنے لگے: محمد تو ہمیں قیصر و کسریٰ کے خزانے پانے کی باتیں سناتے ہیں۔ اور یہاں حالت یہ ہے کہ ہم قضائے حاجت کے لیے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو بلاشبہ بنوقریظہ کے بارے میں حضرت سعد بن معاذ کا فیصلہ بالکل درست، صحیح اور حق و انصاف پر مبنی تھا۔

اس فیصلے کی روشنی میں چھ یا سات سو کے لگ بھگ یہودیوں کو قتل کر دیا گیا، قیدیوں اور بچوں کو حضرت سعد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں نجد بھیج کر ان

کے عوض گھوڑے اور ہتھیار خرید لیے گئے۔ اس طرح آستین کے ان سانپوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا اور مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست ایک خبیث سازشی گروہ کی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی۔

بنو قریظہ کے اموال رسول اللہ ﷺ نے خمس نکال کر تقسیم فرما دیے۔ شہسوار کو تین حصے دیے۔ ایک حصہ اس کا اپنی شرکت کے باعث اور دو حصے گھوڑے کے سبب، جبکہ پیدل کو ایک حصہ مرحمت فرمایا۔

بنو قریظہ کا کام تمام ہوا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی دعا کی قبولیت کا وقت بھی آ گیا۔ ان کا زخم دوبارہ پھوٹ پڑا جس کے نتیجے میں وہ شہید ہو گئے۔ ان کی عمر اس وقت صرف 37 برس تھی۔ قبیلہ اوس سے تعلق رکھنے والے سعد نہایت خوبصورت تھے۔ اونچا لمبا قد، سفید رنگ اور خوبصورت داڑھی تھی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ان کی وفات پر رحمان کا عرش ان کی عالم بالا میں تشریف آوری کی خوشی کے پیش نظر جھوم اٹھا۔ امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: عرش الٰہی کو یہ شعور عطا کیا گیا ہے کہ وہ خوشی کے باعث حرکت میں آیا۔ جنازہ اٹھایا گیا تو وہ نہایت ہلکا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسے فرشتوں نے اٹھا رکھا ہے۔ نسائی کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ ان کے جنازے میں ستر ہزار ایسے فرشتوں نے شرکت فرمائی جن کا اس سے پہلے زمین پر کبھی نزول نہیں ہوا تھا۔ ان کی قبر نے پہلے انھیں دبایا مگر بعد ازاں فراخ کر دی گئی۔ ان کی والدہ نے گریہ کیا تو ارشاد فرمایا کہ تمام گریہ

کرنے والی عورتیں جھوٹی ہیں مگر ام سعد سچی ہیں۔ جنت میں ان کے مقام و منزلت کی نشاندہی اس طرح کی گئی کہ اللہ کے رسول ﷺ کو ایک رومال تحفۃً پیش کیا گیا۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے، جسے براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ صحابۂ کرام نے اس رومال کو چھوا تو اس کے انتہائی نرم و نازک ہونے پر حیرت زدہ رہ گئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اس رومال کے نرم و نازک ہونے پر تعجب کرتے ہو، جنت میں حضرت سعد کا رومال اس سے کہیں زیادہ نرم اور خوبصورت ہے۔[1]

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 3/249-251, 256, 262, 263، والبدایۃ والنہایۃ (ملخصا): 4/122-130.

75

رسول اللہ ﷺ کے پسینے کی مہک

سیرت کے قارئین کے لیے سیدہ ام سلیم رمیصاء بنت ملحان کا نام بڑا معروف ہے۔ یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ اور مشہور صحابی حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ سے بے پناہ محبت اور احترام کا رشتہ تھا۔ قدیم الاسلام تھیں۔ پہلے خاوند مالک بن نضر نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شام کی طرف نکل گیا اور وہیں حالت کفر میں مر گیا۔ ام سلیم نے اپنے ننھے سے بیٹے انس کو شروع ہی سے اسلام اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت میں طاق کر دیا۔ نہایت سمجھدار، مدبر اور بہادر خاتون تھیں۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ان کی والدہ کا غالبًا رضاعی رشتہ تھا۔ اس وجہ سے وہ آپ ﷺ سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ آپ بعض اوقات ان کے گھر تشریف لے جاتے اور قیلولہ فرماتے۔ چارپائی پر چمڑے کا ٹکڑا

تھا۔ آپ ﷺ کو پسینہ آیا تو چمڑے میں جذب نہ ہوا۔ ام سلیم نے موقع غنیمت جانا اور آپ ﷺ کے پسینے کو ایک چھوٹی سی بوتل میں جمع کر لیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھا تو دریافت فرمایا: ام سلیم یہ کیا کر رہی ہو؟ کہنے لگیں کہ آپ کا مبارک پسینہ ہے، میں اسے دوسری خوشبوؤں میں شامل کر لیتی ہوں۔ فرماتی تھیں: آپ ﷺ کا پسینہ بہترین خوشبو ہے۔[1] ام سلیم نے اپنے بیٹے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو وصیت کی کہ میری وفات کے بعد میرے کفن پر اللہ کے رسول ﷺ کا پسینہ لگا دینا، چنانچہ انھوں نے اپنی والدہ کی وصیت پر عمل کیا۔ واضح رہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی ذاتی اشیاء سے تبرک حاصل کرنا درست ہے مگر اللہ کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی اور شخصیت کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2332،2331، ومسند أحمد: 287،239،146:3.

76

داستان مسجد نبوی کے ایک ستون کی ......

مسجد نبوی کے حصے ریاض الجنۃ میں مختلف ستون ہیں۔ ان میں سے ہر ستون کا ایک تاریخی پس منظر اور وجہ تسمیہ ہے۔ رسول کریم ﷺ سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ ستون اپنے اندر ایک خاص جاذبیت اور کشش رکھتے ہیں۔ بعض پر ان کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو ان میں ایک نام ''اسطوانہ ابولبابہ'' بھی ہے۔ یہ ستون ابولبابہ سے کیوں منسوب ہے؟ آئیے۔ یہ جاننے کے لیے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں۔

یہ انصاری صحابی تھے۔ بنوقریظہ کے علاقہ میں ان کے باغات تھے۔ آل اولاد بھی وہیں تھی۔ اسلام سے پہلے یہ بنوقریظہ کے حلیف تھے۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کے سابقہ تعلقات اور لین دین باقی رہا۔ یہودیوں نے غزوۂ خندق یا احزاب میں مسلمانوں کے ساتھ جو بدعہدی اور غداری کی وہ قارئین سیرت سے

ڈھکی چھپی نہیں۔ غزوہ خندق میں مسلمانوں کی فتح کا تصور بھی مشکل تھا۔ دس ہزار کا لشکر جرار جس نے یہودیوں کے ایماء پر مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ مدینہ کی چھوٹی سی بستی جس کے بچوں، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں کی کل تعداد پانچ ہزار سے زائد نہ تھی، اُسے صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے کفر کی ساری طاقتیں اتحادی بن کر جمع ہو گئی تھیں۔ یہ ایک معجزہ اور اللہ کی خاص مدد تھی کہ مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے۔ دوران جنگ مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کرنا، کافروں کا ساتھ دینا، مسلمان عورتوں کے قلعے پر حملہ کا ارادہ کرنا، بنیادی طور پر اس جنگ کی آگ بھڑکانا اور کافروں کو حملے پر اُکسانا معمولی جرائم نہ تھے۔ کہ ان پر خاموشی اختیار کر لی جاتی۔ اللہ کے رسول ﷺ خندق سے واپس آئے تو حضرت جبریل علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے۔ عرض کیا: آپ ﷺ نے تو ہتھیار رکھ دیے ہیں مگر فرشتوں نے ابھی ہتھیار نہیں رکھے۔ اٹھیے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ بنو قریظہ کا رخ کیجیے۔ آپ ﷺ نے فوراً اعلان کرایا کہ جو شخص ہمارا مطیع اور فرمانبردار ہے وہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے انتظامی اُمور ابن ام مکتوم کو سونپے۔ اور بنو قریظہ کے دیار میں ''انا'' نامی کنویں کے قریب قیام فرمایا۔ یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ شروع ہوا تو ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہ بچا۔ انھوں نے سوچا کہ ہتھیار ڈالنے سے پہلے کیوں نہ اپنے حلیفوں سے مشورہ کر لیں۔ ممکن ہے معلوم ہو جائے کہ ہتھیار ڈالنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ انھوں نے مشورہ کے لیے اپنے پرانے حلیف ابولبابہ بن عبدالمنذر کا انتخاب کیا۔ پھر اللہ کے

رسول ﷺ سے بنو قریظہ نے درخواست کی کہ انھیں ان کے پاس بھیج دیں۔ تاکہ ان سے مشورہ کر سکیں، جب وہ وہاں پہنچے تو مرد ان کی طرف دوڑ پڑے اور عورتیں اور بچے ان کے سامنے دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ ابولبابہ نے ان کی حالت دیکھی تو رقت طاری ہو گئی۔ یہود نے ان سے مشورہ کیا کہ کیا ہم محمد ﷺ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیں؟ انھوں نے کہا: ہاں! مگر ساتھ ہی حلق کی طرف ہاتھ سے اشارہ بھی کر دیا۔ مراد یہ تھی کہ اب ذبح کر دیے جاؤ گے۔ وہ غیر ارادی طور پر ذبح کا اشارہ تو کر بیٹھے مگر فوراً ہی احساس ہوا کہ یہ اشارہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت ہے، چنانچہ وہ بجائے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آنے کے سیدھے مسجد نبوی پہنچے اور اپنے آپ کو اس ستون کے ساتھ باندھ لیا جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کے شروع میں کیا ہے۔ انھوں نے کہا: اب مجھے اللہ کے رسول ﷺ ہی کھولیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب میری توبہ قبول ہو گی تبھی میں اپنے آپ کو آزاد کروں گا۔ وہ مسلسل چھ دن اور چھ راتیں اسی ستون کے ساتھ بندھے رہے۔ ان کی بیوی نمازوں کے اوقات میں اُنھیں کھول دیتیں اور نماز ادا کرنے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں۔

ابولبابہ بن عبدالمنذر کے اس واقعہ میں دوسرے بہت سے اسباق کے ساتھ ساتھ یہ سبق بھی موجود ہے کہ ایک شخص سے نادانی میں بلا ارادہ ایک فوجی راز افشا ہو گیا۔ اس غلطی کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ وہ چاہتے تو کسی کو اپنی غلطی کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے۔ مگر یہ قوت ایمانی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اور یہ

احساس تھا کہ میرا سمیع وبصیر اور دانائے قلوب پروردگار مجھے دیکھ رہا ہے۔ اسی احساس کے زیرِ اثر انھوں نے نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کیا بلکہ اپنے لیے ازخود سزا بھی تجویز کر لی اور اپنے آپ کو ستون کے ساتھ باندھ لیا۔ کسی بھی مہذب معاشرے میں گناہ کے معترف اور نادم شخص کے لیے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کے جذبات جوش مارنے لگتے۔ گناہ پر اصرار، فخر اور اس پر اڑے رہنا بدبختی کی نشانی ہے۔ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ اور بھی اہم تھا۔ یہ اپنی قوم کے سرکردہ اور نمایاں افراد میں سے تھے، لہٰذا لوگوں کی دلی خواہش تھی کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے۔ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی چاہتے تھے، چنانچہ چھ راتیں گزرنے کے بعد صبح سویرے یہ وحی نازل ہوئی۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

''کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کا عمل ملا جلا ہے کچھ نیک ہے اور کچھ برا۔ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر پھر رحمت کی نظر فرمائے کیونکہ وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''[1]

اس روز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ اس شفیق، رحیم و رؤف اور مہربان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس ساتھی کی توبہ قبول ہونے

---

1 التوبۃ 102:9.

پر اتنی خوشی ہوئی کہ فرط مسرت سے بے اختیار ہنس پڑے۔ صحابہ کرام ہوں یا صحابیات یا امہات المؤمنین ان کی جناب رسالت مآب ﷺ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ اللہ کے رسول کی ایک ایک بات نوٹ کرتے تھے۔ ہماری اماں جان سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو ہنستے دیکھا تو عرض کرنے لگیں (مِمَّ تَضْحَكُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ أَضْحَكَ اللّٰهُ سِنَّكَ)۔ اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ہمیشہ اسی طرح ہنساتا رہے۔ ارشاد ہوا کہ ابولبابہ کی توبہ قبول ہوگئی۔ اس وقت تک پردہ کے احکامات نازل نہیں ہوئے تھے۔ ام سلمہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! اگر اجازت ہو تو میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو خوشخبری سنا دوں۔ ارشاد ہوا: ہاں اگر چاہو تو (سنا دو)۔ وہ اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑی ہوگئیں اور فرمانے لگیں: اے ابولبابہ (أَبْشِرْ فَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكَ) ''تمھیں مبارک ہو اللہ نے تمھاری توبہ قبول کر لی۔'' ادھر صحابہ کرام کو یہ خبر ملی تو وہ ابولبابہ کو کھولنے کے لیے دوڑے چلے آئے۔ اب ذرا دنیائے محبت کی یہ ادا بھی ملاحظہ فرمائیں۔ انھوں نے فوراً صحابہ کو روک دیا۔ کہنے لگے کہ (لَا، وَاللّٰهِ! حَتّٰى يَكُونَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الَّذِي يُطْلِقُنِي بِيَدِهِ)

''اللہ کی قسم! اب تو مجھے اللہ کے رسول ﷺ ہی اپنے دست مبارک سے آزاد فرمائیں گے'' چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ فجر کی نماز کے لیے نکلے تو آپ ﷺ نے انھیں خود اپنے دست مبارک سے کھولا اور آزاد فرما دیا۔[1]

---

[1] السیرة النبویة لابن ہشام 3/244-248.

77

منافقین کا گھناؤنا کردار

غزوۂ بنی مصطلق یا غزوۂ مُریسیع شعبان 6 ہجری میں پیش آیا۔ مکہ سے مدینہ جائیں تو رابغ کے علاقے میں قدید نامی ایک جگہ ہے۔ اس کے اطراف میں ساحل کے قریب مریسیع نامی ایک چشمہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو اطلاعات ملیں کہ بنو مصطلق کا سردار حارث بن ابی ضرار آپ ﷺ سے جنگ کے لیے اپنے قبیلے اور کچھ دوسرے عربوں کو ساتھ لے کر آ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ کو اس خبر کی تحقیق کے لیے بھیجا، انھوں نے حارث بن ابی ضرار سے خود ملاقات کی اور سارے حالات سے آگاہی حاصل کر کے اللہ کے رسول ﷺ کو مکمل رپورٹ پیش کی۔ دشمن کی تیاریوں کی خبر کی تصدیق ہوگئی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو تیاری کا حکم دیا اور پھر دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہو گئے۔ قبیلہ خزاعہ کے لوگ عام طور پر رسول اللہ ﷺ کے خیر خواہ تھے۔ مگر ان کی

شاخ بنو مصطلق کے لوگ قریش کے طرفدار تھے۔ جب اسلامی لشکر روانہ ہوا تو اس میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے علاوہ منافقین کی ایک جماعت بھی شامل تھی۔ جو اس سے پہلے کسی غزوے میں نہیں گئی۔ مدینہ کا انتظام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا۔ حارث بن ابی ضرار نے اسلامی لشکر کی جاسوسی کے لیے ایک جاسوس بھیجا جو گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ جب دشمن کو اسلامی لشکر کی روانگی اور جاسوس کے قتل کی اطلاع ملی تو اس کی صفوں میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا۔ جو عرب ان کے ساتھ تھے وہ بکھر گئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چشمۂ مریسیع تک پہنچے تو دشمن کو آمادۂ جنگ پایا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ کافروں میں سے بعض قتل ہوئے اور بعض قیدی بنے۔ عورتوں اور بچوں کو قید کر کے مال مویشی پر قبضہ کر لیا گیا۔ قیدیوں میں سردار قبیلہ حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہ بھی تھیں۔ وہ ثابت بن قیس کے حصہ میں آئیں۔ ثابت نے انھیں ''مکاتب'' بنا لیا۔ مکاتب اس لونڈی یا غلام کو کہتے ہیں جو اپنے مالک سے یہ طے کر لے کہ وہ ایک مقررہ رقم مالک کو ادا کر کے آزاد ہو جائے گا۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اس غزوہ میں عبداللہ بن ابی سمیت منافقین کی ایک جماعت بھی شامل تھی۔ ان لوگوں کا کام ہی فتنہ و فساد برپا کرنا تھا۔ یہ بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے کہ کس طرح مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوائیں۔ اس غزوہ میں انھیں یہ موقع میسر آ گیا۔ تمام سیرت نگاروں نے ان دو بڑے واقعات کا ذکر کیا ہے جو اس غزوہ میں پیش آئے۔ اسی لیے یہ غزوہ مشہور ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے نہایت آسانی سے دشمن پر قابو پا لیا مسلمانوں کا جانی نقصان یہ ہوا

کہ صرف ایک شخص مارا گیا۔ اُسے بھی ایک انصاری نے دشمن کا آدمی سمجھ کر مار دیا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ غزوۂ بنی المصطلق سے فارغ ہو کر ابھی چشمۂ مریسیع ہی پر قیام فرما تھے کہ چشمہ پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مزدور جہجاہ غفاری جو مہاجر تھے اور ایک انصاری صحابی سنان بن وبر جہنی کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ بات معمولی تھی۔ پانی لینے اور پلانے پر تو تو میں میں ہوگئی۔ ان دونوں نے بلند آہنگی سے صدا لگائی۔ ایک نے مہاجروں کو آواز دی کہ دوڑو مجھے انصاری مار گیا۔ انصاری نے انصار کے نام کی دہائی دی۔ دونوں طرف سے لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ قبائلی تعصب بھڑک اٹھا۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی قریب ہی تشریف فرما تھے۔ اطلاع ملی تو فوراً موقع پر تشریف لے آئے۔ دیکھا کہ دونوں طرف کے لوگ غصے میں ہیں۔ آپس میں لڑائی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ آپ ﷺ فریقین کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ ارشاد فرمایا کہ میری موجودگی میں جاہلیت کی یہ ندا کیسی ہے؟ مہاجرین اور انصار دونوں کو ندامت ہوئی کہ واقعی ہم سے کیسی سنگین غلطی ہونے کو تھی۔ اب دونوں طرف سے صلح اور پیار و محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب لوگ آپس میں شیر و شکر ہو گئے۔ مگر یہ پیار محبت کی باتیں اور لڑائی جھگڑے سے اجتناب منافقین کو کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ عبداللہ بن ابی غصے سے بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا:

کیا ان لوگوں نے ایسی حرکت کی ہے؟ یہ ہمارے علاقے میں آکر اب ہمارے ہی حریف اور مدِ مقابل ہو گئے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہماری اور ان کی حالت پر تو وہی مثل صادق آتی ہے جو پہلے لوگوں نے کہی ہے کہ اپنے کتے کو پال پوس کر

موٹا تازہ کروتا کہ تمھی کو پھاڑ کھائے۔ سنو! اللہ کی قسم! اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو ہم میں سے معزز ترین آدمی، ذلیل ترین آدمی کو نکال باہر کرے گا، پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر بولا: یہ مصیبت تم نے خود مول لی ہے۔ تم نے انھیں اپنے شہر میں بسایا۔ اور اپنے اموال ان میں بانٹ دیے۔ دیکھو! تمھارے ہاتھوں میں جو کچھ ہے اگر انہیں دینا بند کر دو تو یہ تمھارا شہر چھوڑ کر کہیں اور چلتے بنیں گے۔

اس وقت مجلس میں ایک نوجوان صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے آکر اپنے چچا کو پوری بات سنائی۔ ان کے چچا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ وہ بولے: اللہ کے رسول! عباد بن بشر سے کہیے کہ اسے قتل کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! یہ کیسے مناسب رہے گا؟ لوگ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے۔ نہیں بلکہ تم کوچ کا اعلان کر دو۔ یہ ایسا وقت تھا جس میں آپ کوچ نہیں فرمایا کرتے تھے۔ لوگ چل پڑے تو حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے۔ اور سلام کر کے عرض کیا کہ آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے وقت کوچ فرمایا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے صاحب (ابن اُبی) نے جو کچھ کہا ہے تمھیں اس کی خبر نہیں ہوئی؟ انھوں نے دریافت کیا کہ اس نے کیا کہا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا خیال ہے کہ وہ مدینہ واپس ہوا تو معزز ترین آدمی ذلیل ترین آدمی کو مدینہ سے نکال باہر کرے گا۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں تو اسے مدینے سے نکال باہر کریں۔ اللہ کی قسم! وہ ذلیل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم باعزت ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس

کے ساتھ نرمی کیجیے کیونکہ، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے پاس اس وقت لایا جب اس کی قوم اس کی تاجپوشی کے لیے مونگوں کا تاج تیار کر رہی تھی، اس لیے وہ یہی سمجھتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے اس کی بادشاہت چھین لی ہے۔

پھر آپ شام تک پورا دن اور صبح تک پوری رات چلتے رہے۔ بلکہ اگلے دن کے ابتدائی اوقات میں بھی اتنی دیر تک سفر جاری رکھا کہ دھوپ سے تکلیف ہونے لگی۔ اس کے بعد اتر کر پڑاؤ ڈالا گیا تو لوگ سواریوں سے اترتے ہی بے خبر ہو کر سو گئے۔ آپ ﷺ کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگوں کو بیٹھ کر گپ لڑانے کا موقع نہ ملے۔

ادھر عبداللہ بن ابی کو پتہ چلا کہ زید بن ارقم نے بھانڈا پھوڑ دیا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اللہ کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ جو بات آپ ﷺ تک پہنچی ہے وہ اس نے ہرگز نہیں کہی۔ اس وقت وہاں انصار کے لوگ بھی موجود تھے انھوں نے بھی کہا: اللہ کے رسول! زید ابھی لڑکا ہے۔ ممکن ہے اسے وہم ہو گیا ہو۔ اور اس شخص نے جو کچھ کہا تھا اسے ٹھیک ٹھیک یاد نہ رکھ سکا ہو، چنانچہ آپ نے ابن ابی کی بات سچ مان لی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس پر مجھے ایسا غم لاحق ہوا کہ ویسے غم سے میں زندگی میں کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ میں صدمے کے باعث اپنے گھر ہی میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقین نازل فرمائی۔ جس میں دونوں باتیں مذکور ہیں:

﴿ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ﴾

”یہ منافقین وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ جولوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہیں، ان پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ چلتے بنیں“[1]

﴿ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ﴾

”یہ منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو وہاں سے عزت والا ذلیل کو نکال باہر کریگا۔“[2]

حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلوایا۔ اور یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں، پھر فرمایا: اللہ نے تمھاری بات کی تصدیق کر دی۔

اس منافق کے صاحبزادے جن کا نام بھی عبد اللہ ہی تھا، اس کے بالکل برعکس نہایت نیک طینت انسان اور خیارِ صحابہ میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے باپ سے برأت اختیار کر لی۔ اور مدینہ کے دروازے پر تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے۔ جب ان کا باپ عبد اللہ بن اُبَی وہاں پہنچا تو اس سے بولے: اللہ کی قسم! تم یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اجازت دے دیں۔ کیونکہ محمد ﷺ عزت والے ہیں اور تم ذلیل ہو۔ اس کے بعد جب نبی ﷺ وہاں تشریف لائے تو آپ نے اُسے مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ اس کے

---

[1] المنٰفقون 7:63.

[2] المنٰفقون 8:63.

بعد صاحبزادے نے باپ کا راستہ چھوڑا۔ عبداللہ بن اُبی کے ان ہی صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو مجھے حکم فرمایئے، اللہ کی قسم! میں اس کا سر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔[1]

---

[1] ملخصا من تفسیر ابن کثیر: 4/152-157، والبدایۃ والنھایۃ، حدیث: 4/156-159.

78

دیکھو! وہ جنتی جا رہا ہے

وہ نجد کا ایک بدو تھا۔ گفتگو اتنی شانداراور دلپذیر کرتا کہ سننے والے حیرت زدہ رہ جاتے۔ اسے فصیح عربی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ بڑا خوبصورت ، گورا چٹا رنگ ، بالوں کے پٹے کانوں کی لوتک سے نکلے ہوئے جیسے چاند کے گرد ہالہ ہو۔

وہ اپنی قوم کا سفیر بن کر مدینہ طیبہ پہنچا۔ اونٹنی پر سوار یہ بدو سیدھا مسجد نبوی میں آیا اور اللہ رے بدوی فطری بے خوفی ! کہ اپنی اونٹنی بھی مسجد کے اندر لے گھسا۔ اونٹنی ایک کونے میں بٹھادی اور خود اس حلقے کی طرف بڑھا جہاں سرور کائنات ﷺ تشریف فرما تھے۔ حلقے کے قریب پہنچا تو سلام نہ دعا ، چھٹتے ہی اس نے بدوی لہجے میں پوچھا کہ محمد (ﷺ) کہاں ہیں؟۔ اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یہ جو روشن چہرے والے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں یہی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اب وہ بدو

اللہ کے رسول سے براہ راست مخاطب ہوا۔ کہنے لگا: آپ ہی ابن عبدالمطلب ہیں؟۔ ارشاد ہوا: تمھارے سوال کا جواب دیا جا چکا ہے۔ یہ شخص جس کا نام ضمام بن ثعلبہ تھا، نجد کا رہنے والا تھا۔ داعیان توحید جب اس علاقے کے قبیلہ بنوسعد میں پہنچے تو ان لوگوں نے جو طبعاً دور رس اور معاملہ فہم تھے رسول اللہ ﷺ کے سفیر سے خاصی معلومات حاصل کیں۔ بہت سارے سوال جواب ہوئے۔ دین کیا ہے؟ اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں، ارکان اسلام کے بارے میں۔ انھیں بہت کچھ بتایا گیا تو انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنا ایک نمائندہ مدینہ بھیجا جائے جو بالمشافہ گفتگو کرے اور ان باتوں کی تصدیق کر آئے، چنانچہ انھوں نے باہم مشورے کے بعد ایک نہایت سمجھدار اور ذہین و فطین شخص ضمام بن ثعلبہ کو مدینہ بھیجا۔ ہر چند یہ بدو تھا مگر اتنے اچھے اسلوب سے گفتگو کرتا تھا کہ اس کے انداز گفتگو پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت نے فرمایا: میں نے ضمام سے بہتر اور مؤثر گفتگو کرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ ضمام نے کہا: اللہ کے رسول! میں قبیلہ بنی سعد بن بکر سے تعلق رکھتا ہوں میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے۔ میری قوم نے چند باتوں کی تحقیق کے لیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں بدو ہوں۔ میرے لب ولہجے اور اندازِ گفتگو کی شدت کو محسوس نہ فرمایئے گا۔ ارشاد ہوا: جو انداز گفتگو چاہو، اختیار کرلو۔ میرے دل میں ہرگز کوئی میل نہیں آئے گا۔ تم ...... بے تکلف ہوکر اطمینان سے ...... بات کرو۔

اب اس نے بولنا شروع کیا: آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے رب اور آپ سے

پہلوں کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو تمام ابنائے آدم کی طرف نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے؟۔ ارشاد ہوا: ''اَللّٰھُمَّ نَعَمْ'': ہاں! اللہ گواہ ہے، اسی نے مجھے منصب رسالت عطا فرمایا ہے۔

اس نے کہا: میں آپ ﷺ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی آپ ﷺ کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ دن اور رات میں پانچ مرتبہ نماز ادا کریں؟۔ ارشاد ہوا: اللہ کی قسم! حقیقت یہی ہے۔

اس نے اگلا سوال کیا: میں آپ ﷺ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ سال بھر میں ایک ماہ (رمضان) کے روزے رکھیں؟۔ فرمایا: اللہ کی قسم! ایسا ہی ہے۔ ضمام نے مزید کہا: میں آپ ﷺ سے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے آپ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ امراء سے صدقہ، یعنی زکاۃ لے کر فقراء میں تقسیم کر دی جائے؟۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں بالکل ایسا ہی ہے۔ اب ضمام نے بے ساختہ کہا: جو احکام آپ ﷺ لے کر آئے ہیں، میں ان پر ایمان لاتا ہوں۔

قارئین کرام! یہ جو ایمان افروز مکالمہ درج کیا گیا ہے یہ صحیح بخاری کی حدیث نمبر 63 سے لیا گیا ہے۔ صحیح مسلم میں یہی واقعہ سوال و جواب کی شکل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ضمام نے پوچھا: ان بلند و بالا آسمانوں کو کس نے بنایا ہے؟۔ ارشاد ہوا: اللہ

تعالیٰ نے۔ اس نے دریافت کیا: یہ زمین کس نے بچھائی ہے؟ ارشاد فرمایا: اللہ نے۔ عرض کیا: اچھا تو ان پہاڑوں کو کس نے نصب کیا ہے؟ جواب ملا: اللہ تعالیٰ نے۔ اس نے کہا: جس ذات نے آسمانوں کو بلند کیا، زمین کو بچھایا اور پہاڑوں کو نصب کیا اس کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اسی نے آپ کو ہمارے لیے رسول بنا کر مبعوث فرمایا ہے؟۔ اللہ کے رسول ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے۔ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ آپ نے فوراً ٹیک چھوڑ دی۔ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ چہرہ اقدس احساس ذمہ داری سے سرخ ہو گیا اب ارشاد فرمایا: اَللّٰهُمَّ نَعَمْ ''، اللہ شاہد ہے، واقعہ یہی ہے، پھر اس نے ارکان اسلام کے بارے میں کچھ سوالات کیے، کلمہ شہادت پڑھا، مسلمان ہونے کے شرف سے مشرف ہوا اور کہنے لگا: اللہ کی قسم! جو کچھ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے، میں اس میں کوئی کمی کروں گا نہ اضافہ!...... پھر وہ مجلس سے اُٹھا اور واپس چلا گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ اُسے شفقت بار نظروں سے واپس جاتا دیکھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اسی عالم مسرت میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا: (مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلٰى رَجُلٍ مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ إِلٰى هٰذَا) ''جو یہ چاہتا ہو کہ کسی جنتی کو دیکھے تو وہ ضمام بن ثعلبہ کو دیکھ لے۔''[1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 63، وصحیح مسلم، حدیث: 12,11.

79

یہ رحمت ہی نہیں عدیم المثال رحمت ہے

تاریخ اسلامی کے صفحات میں ثمامہ بن اثال کا نام جلی حروف سے رقم ہے۔ یہ شخص یمامہ کے علاقے کا حکمران تھا۔ یہ علاقہ آج کل کے سعودی دارالحکومت ریاض کے قرب و جوار میں واقع تھا۔ ثمامہ اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ اس نے اللہ کے رسول ﷺ کو معاذ اللہ! قتل کرنے کا چیلنج دے رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے بھی اللہ سے اس پر قابو پانے کی دعا فرمائی تھی۔ ایک مرتبہ ثمامہ عمرہ کرنے کے ارادے سے نکلا۔ اس کی قسمت کہ وہ راستہ بھول گیا اور مدینہ طیبہ کے قریب جا نکلا۔ مسلمانوں کے حفاظتی دستے ہر وقت مدینہ منورہ کے اطراف میں پٹرولنگ کرتے رہتے تھے۔ کوئی مشکوک شخص، دشمن کا کوئی جاسوس یا کوئی کافر برے ارادے سے مدینہ منورہ کا رخ کرتا تو حفاظتی دستے اس کے ناپاک ارادے ناکام بنا دیتے تھے۔ ثمامہ بھی ایک حفاظتی دستے کی گرفت میں آ گیا۔ چونکہ یہ شخص اپنے

کفر میں معروف تھا اور اسلام دشمنی میں اس کے عزائم ڈھکے چھپے نہ تھے، اس لیے اُسے گرفتار کر کے مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کو اس دشمن اسلام کی گرفتاری کی خبر دی گئی۔ آپ تشریف لائے۔ اُسے دیکھا۔ لمبا قد، خوبصورت چہرہ، توانا جسم، بھرا ہوا سینہ، اکڑی ہوئی گردن، اٹھی ہوئی نگاہیں، تمکنت، شان، شکوہ، سطوت، صولت، غرض حکمرانی کی تمام تر رعونت اس کی شخصیت سے ٹپک رہی تھی۔

آپ ﷺ آگے بڑھے اور پوچھا: ثمامہ کیا حال ہے؟۔ آخر میرے رب نے مجھے تم پر قابو دے ہی دیا۔ اس نے نہایت غصے اور تکبر سے جواب دیا: اے محمد (ﷺ) ٹھیک ہے۔ معاملہ ایسا ہی ہو گیا ہے، مگر سنو! (إِنْ تَقْتُلْ تَقْتُلْ ذَا دَمٍ، وإِن تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلَى شَاكِرٍ، وَ إِنْ تَسْأَلْ مَالًا تُعْطَهُ) اگر مجھے قتل کرو گے تو میرے قتل کا بدلہ لیا جائے گا کیونکہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اور اگر احسان کرو گے تو ایک ایسے شخص پر احسان کرو گے جو اس کا شکر گزاری کے ساتھ بدلہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہاں، اگر مال و دولت کی ضرورت ہو تو بات کرو، جتنا چاہو دیا جا سکتا ہے“۔

قارئین کرام! ذرا یہاں رک جائیے۔ اس کی گفتگو اور لب و لہجے پر غور فرمائیے کہ وہ تاریخ کی سب سے بڑی شخصیت سے کتنی بے ادبی اور کس قدر تکبرانہ انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔ دنیا کا کوئی اور حکمران ہوتا تو اسی وقت اس گستاخ کی گردن اڑا دینے کا حکم دیتا۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے حلم، صبر و ثبات اور عالی ظرفی کے کیا

کہنے کہ یہ گستاخانہ گفتگو سننے کے بعد بھی اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا۔ کوئی سخت بات نہیں فرمائی بلکہ صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اس کی دودھ سے ضیافت کرو!

دوسرا دن ہوا تو پھر اللہ کے رسول ﷺ ثمامہ کے پاس سے گزرے اور دریافت فرمایا: ثمامہ کیسے ہو؟

اس نے پھر کہا: اے (محمد ﷺ) خیریت سے ہوں۔ ''اگر قتل کر دو گے تو یہ ایک ایسے شخص کا قتل ہوگا جس کا خون رائیگاں نہ جائے گا اگر معاف کر دو گے تو شکریہ ادا کریں گے اور اگر مال چاہتے ہو تو بات کرو۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم جیسے مساکین آپس میں گفتگو کرتے تو کہتے تھے کہ اسے قتل کر کے کیا ملے گا۔ امیر آدمی ہے، اس سے مال ہی لے لینا چاہیے۔ کم از کم کچھ دنوں کے لیے روٹی تو میسر آ جائے گی۔ تیسرا دن ہوا آج اسی چیز کا فیصلہ ہونا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پھر پوچھا: ثمامہ کس حال میں ہو؟۔ اس نے حسب سابق کہا: خیر ہے اور ساتھ ہی اپنے گزشتہ الفاظ دہرا دیے جن میں اس نے بڑے غرور سے فخریہ انداز میں اپنے قبیلے کا ذکر کیا اپنے مال و دولت کی کثرت کا اظہار کیا اور ساتھ ہی دھمکی بھی دے ڈالی۔ اب صحابہ کرام منتظر تھے کہ اس گستاخ کو کیا سزا ملتی ہے۔ وہ آپ کی آواز اور حکم کی طرف کان لگائے کھڑے تھے کہ رحمت للعالمین ﷺ نے حکم دیا: اس کی رسیاں کھول دو، پھر فرمایا: ثمامہ! جاؤ میں تمھیں بغیر کسی شرط کے رہا کرتا ہوں۔

حکم کی تعمیل ہوئی۔ ثمامہ کو رہا کر دیا گیا۔ اس نے اپنی سواری پکڑی اور اس کا رخ مدینہ سے باہر کی جانب کر کے اسے دوڑانے لگا۔ رسول اللہ ﷺ کے لطف و کرم سے وہ اپنی جان سلامت لے کر نکل آیا تھا لیکن وہ اپنے دل کو رحمت للعالمین کے تیرِ محبت سے نہ بچا سکا۔ مسجد نبوی سے باہر نکلتے ہوئے اُسے بے اختیار خیال آیا کہ اتنا برگزیدہ اور اتنا بلند حوصلہ انسان تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میرے الفاظ میں کتنی شدت اور حدت تھی۔ مگر اس کے باوجود ان کا تحمل ان کے غصہ پر غالب رہا اور انھوں نے مجھے رہا کر دیا...... بقول شاعر کیفیت کچھ اس طرح سے تھی:

؎ اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!!

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ مدینہ کے ایک نواحی باغ میں گیا، کنویں پر غسل کیا، صاف ستھرے کپڑے پہنے، پھر اس کے قدم خود بخود مسجد نبوی کی طرف بڑھنے لگے۔ اللہ کے رسول ﷺ ابھی تک وہیں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے اسے دیکھا تو فرمایا: ثمامہ! ہم نے تو تمھیں چھوڑ دیا تھا پھر کیسے آنا ہوا۔ اُس نے عرض کیا: آپ کا رہا کرنا بھی کیا خوب رہا کرنا ہے۔ آپ نے چھوڑا تو ہے مگر ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر۔ اب میں آپ ہی کا غلام ہوں۔ میری تمنا ہے کہ مجھے کلمہ پڑھایئے اور اپنے جاں نثاروں میں شامل کر لیجیے۔ اسلام کی نعمت ملنے کے بعد اس نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! اس کائنات میں آپ کا چہرہ میرے لیے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا۔ آپ کے دین کو میں نہایت برا سمجھتا تھا۔ آپ کا شہر میرے

لیے سب سے ناپسندیدہ تھا۔ مگر اب جبکہ میں آپ ﷺ کا امتی بن گیا ہوں اور میں نے آپ ﷺ کی بیعت کر لی ہے تو اب آپ ﷺ کا چہرہ مجھے ساری کائنات کے چہروں سے زیادہ محبوب ہے، دنیا کا کوئی دین آپ کے دین سے بہتر اور افضل نہیں۔ اور آپ کی یہ بستی روئے زمین کی ساری بستیوں کے مقابلے میں میرے لیے محبوب ترین ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔

اس نے مزید عرض کیا: اللہ کے رسول! میں اپنے دین کے مطابق عمرہ کی نیت سے گھر سے نکلا تھا۔ اب جبکہ میں مسلمان ہو گیا ہوں مجھے عمرہ کی اجازت عطا فرمائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی تربیت فرمائی اور عمرے کا طریقہ بتایا۔ وہ مکہ مکرمہ چل دیا۔ ثمامہ عرب کے حکمرانوں میں نمایاں مقام کا حامل تھا۔ مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران وہ اللہ کے رسول ﷺ کی صفات اور اسلام کے حوالے سے مجالس میں گفتگو کرتا رہا۔ کفار کے لیے یہ باتیں بہت تکلیف دہ تھیں، چنانچہ انھوں نے کہا: (صَبَأَ ثُمَامَةُ) ''ثمامہ بے دین ہو گیا۔'' اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں بے دین نہیں ہوا بلکہ مسلمان ہوا ہوں۔ میں نے محمد ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ثمامہ کی جان ہے! یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی اب محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر مکہ میں نہیں آئے گا۔ اپنے وطن پہنچ کر اس نے اپنی بات پر عمل کیا اور مکہ کو اناج کی

سپلائی بند کر دی۔ مکہ میں قحط کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اہل مکہ نے اللہ کے رسول ﷺ کو خط لکھا جس میں اپنی قرابت کا واسطہ دیا اور درخواست کی کہ ثمامہ کے نام یمامہ سے گندم کی ترسیل کے لیے حکم نامہ جاری فرمائیں......

اب یہاں پھر تھوڑی دیر کے لیے رُکیے اور غور کیجیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کس قدر عالی ظرف اور اعلیٰ اخلاق والے تھے کہ باوجود اہل مکہ کے زبردست مظالم کے آپ نے ثمامہ کو پیغام بھجوایا کہ اہل مکہ کی گندم کی سپلائی بحال کر دیں۔ کیا ایسے اعلیٰ رحم و کرم اور عالی ظرفی کی دنیا میں کوئی اور مثال نظر آتی ہے؟[1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4372، وفتح الباري: 8/109-111، وزاد المعاد: 3/277، والسیرة النبویة لابن ہشام: 4/295,296.

80

سن 6 ہجری کے اواخر میں اللہ کے رسول ﷺ نے حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ صلح طے پا جانے کے بعد مدینہ منورہ پہنچ کر دنیا کی بڑی بڑی بادشاہتوں تک اسلام کا عالمگیر پیغام پہنچانے کے لیے سربراہان مملکت کے نام نامہ ہائے مبارک ارسال کرنے کا فیصلہ فرمایا:

خطوط بھجوانے کے لیے آپ نے مختلف سفیروں کا انتخاب کیا۔ سفیر کے انتخاب کے وقت آپ ﷺ ایک معیار مدنظر رکھتے تھے۔ اس کی شکل وصورت، اس کی جسامت، اس کی ذہانت، فراست، علم، انداز گفتگو، حلم وحوصلہ، حافظہ، قوت مشاہدہ، شہسواری، غرضیکہ ہر لحاظ سے اہل ترین شخص کو خط دے کر روانہ کیا جاتا تھا۔ جب خطوط لکھنے کا ارادہ ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ بادشاہ صرف اسی صورت میں خطوط قبول کرتے ہیں جب ان پر مہر لگی ہوئی ہو، چنانچہ

آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ کے الفاظِ مبارک نقش تھے۔[1] سب سے اوپر لفظ اللہ اس سے نیچے رسول اور اس کے نیچے لفظ محمد کندہ تھا۔ ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کے نام خط لکھوایا اور اس کے لیے اسلام کے ایک عظیم فرزند اور شہسوار عبداللہ بن حذافہ سہمی کا انتخاب فرمایا۔ انہیں حکم ملا کہ وہ آپ ﷺ کا نامہ مبارک بحرین کے حاکم کے سپرد کر دیں جو اسے ایران کے بادشاہ کسریٰ کو پہنچا دیں۔ یہ نامہ بحرین کے حاکم کو محرم 7 ہجری کے شروع میں پہنچایا گیا اور اس نے اسے کسریٰ تک پہنچایا۔ اس خط کا مضمون اس طرح تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ عظیم فارس کے نام......

اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے۔ اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں تمھیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ کیونکہ میں تمام انسانوں کی جانب اللہ کا فرستادہ ہوں۔ تاکہ جو شخص زندہ ہے اسے انجام بد سے ڈرایا جائے اور کافروں پر حق بات ثابت، یعنی حجت تمام ہو جائے۔ پس تم اسلام لاؤ سلامت رہو گے اور اگر اس سے انکار کیا تو مجوس کا بارِ گناہ بھی تم پر ہوگا۔

کسریٰ بن ہرمز نے خط ترجمان کی وساطت سے سنا۔ پہلا ہی فقرہ: محمد رسول اللہ

[1] صحیح البخاري، حدیث 5873,5872.

کی طرف سے کسریٰ عظیم فارس کی جانب کے الفاظ سنے تو آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے نامۂ مبارک چاک کر دیا اور نہایت تکبر سے بولا کہ میری رعایا کا ایک حقیر غلام اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھتا ہے!

اللہ کے رسول ﷺ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مَزَّقَ مُلْكَهُ'' اس نے میرے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی سلطنت کو پارہ پارہ کر لیا ہے۔[1]

---

[1] تاریخ الطبري: 3/142.

81

جب آقا نے نفرت سے منہ پھیر لیا

اللہ کے رسول ﷺ کا نامۂ مبارک کسریٰ کو پہنچا۔ اس نے نہایت تکبر سے اسے پھاڑ دیا۔ اس نے اپنے سیکرٹری کو بلوایا اور کہا کہ فوراً میرے نائب یمن کے گورنر باذان کو خط لکھو کہ وہ یہ معلوم کرے کہ یہ شخص کون ہے جس نے اتنی بڑی جرأت کی ہے کہ مجھے خط لکھا اور میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھ دیا۔ مزید برآں دو مضبوط اور توانا آدمی بھیجو اور اسے گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کرو۔

چنانچہ باذان نے اپنے دو نہایت ہی سمجھ دار آدمی روانہ کر دیے جن میں سے ایک اس کا قہرمان (داروغہ) تھا اور دوسرے کا نام خرخرہ تھا۔ انھیں حکم دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کر لائیں۔ یہ دونوں یمن سے طائف پہنچے۔ یہاں ایک قریشی سے ملے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ آپ ﷺ مدینہ میں ہیں۔ طائف کے لوگوں کو جب ان کے عزائم کا علم ہوا تو وہ

بہت خوش ہوئے۔ کہ لو، مسئلہ حل ہو گیا۔ محمد ﷺ کو کسریٰ نے طلب کر لیا ہے۔ اب وہ خود ہی ان سے نمٹ لے گا۔ قہرمان اور خرخرہ مدینہ پہنچے۔ یہ دونوں بڑے ہٹے کٹے تھے۔ لمبی لمبی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ ڈاڑھی بالکل منڈائی ہوئی تھی۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس پہنچے۔ آپ ﷺ نے ان کی ہیئت کذائی دیکھی تو منہ پھیر لیا۔ قہرمان نے کہا: شہنشاہ کسریٰ کے حکم پر باذان بادشاہ نے ہمیں آپ ﷺ کو گرفتار کرنے کا حکم دیا ہے۔

...... چنانچہ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ اگر آپ (ﷺ) میرے ساتھ چلتے ہیں تو پھر وہ شہنشاہ کسریٰ کو سفارش کرے گا کہ آپ کو کچھ نہ کہا جائے۔ اور آپ کو کچھ عطا بھی کر دے۔ اور اگر آپ نے جانے سے انکار کیا تو پھر آپ اُسے خوب جانتے ہیں۔ وہ آپ (ﷺ) کو اور آپ کی قوم کو تباہ و برباد کر دے گا۔ آپ کی بستیاں ویران کر دے گا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان کی شکل وصورت دیکھ کر آپ نے شدید نفرت کا اظہار کیا اور چہرے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: (وَيْلَكُمَا مَنْ أَمَرَكُمَا بِهٰذَا؟) ''تمھارا ستیاناس ہو، تمھیں ڈاڑھی منڈانے کا حکم کس نے دیا ہے''؟۔ انھوں نے کہا: (أَمَرَنَا رَبُّنَا) ہمیں ہمارے آقا کسریٰ نے حکم دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ولٰكِنْ رَبِّي أَمَرَنِي بِإِعْفَاءِ لِحْيَتِي وَقَصِّ شَارِبِي)۔ ''مگر میرے رب تعالیٰ نے مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس کل آنا۔ رات کو اللہ تعالیٰ نے

رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے بتلا دیا کہ فلاں ماہ کی فلاں تاریخ کو رات کے وقت کسریٰ کے بیٹے شیرویہ نے اپنے باپ کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگلے دن وہ دونوں پھر آئے۔ آپ ﷺ نے ان کو وحی الٰہی کے مطابق بتایا کہ تمھارے شہنشاہ کو اس کے بیٹے نے منگل 10 جمادی الاولی 7 ہجری کی رات کے چھ گھنٹے گزرنے کے بعد قتل کر کے حکومت خود سنبھال لی ہے۔ وہ دونوں حیران رہ گئے۔ بے ساختہ کہنے لگے: آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (إِنَّ رَبِّي قَتَلَ رَبَّكُمَا)۔ ''میرے رب نے تمھارے رب کو ہلاک کر ڈالا ہے۔'' انھوں نے کہا: ہم ابھی بادشاہ باذان کو لکھے دیتے ہیں۔ فرمایا: ہاں، اس کو میری طرف سے یہ خبر پہنچا دو اور لکھ دو کہ میرا دین اور میری حکومت وہاں تک پہنچ کر رہے گی جہاں تک کسریٰ پہنچ چکا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس جگہ رکے گی جہاں سے آگے اونٹ اور گھوڑے کے قدم جا ہی نہیں سکتے (وہاں سے آگے سمندر ہے)۔ تم دونوں اس سے یہ بھی کہہ دینا: اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو جو کچھ تمھارے زیر اقتدار ہے وہ سب میں تمہارے ہی پاس رہنے دوں گا اور تمھیں تمھاری قوم کا بادشاہ بنا دوں گا۔[1]

[1] تاریخ الطبري 3/143 والبدایة والنهایة: 485/6

ارشادِ رسول ﷺ سچ نکلا

قہرمان اور خرخرہ کسریٰ کے مقرر کردہ حاکم باذان کے سفیر کے طور پر مدینہ طیبہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے تھے۔ جب ان کو اللہ کے رسول ﷺ نے وحی الٰہی کے ذریعے بتایا کہ کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ فوراً وہاں سے واپس یمن پہنچے۔ اور باذان کو اپنے دورۂ مدینہ کی مکمل رپورٹ پیش کی۔ ابھی یمن میں کسریٰ کے قتل کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ باذان یہ رپورٹ سن کر کہنے لگا کہ اللہ کی قسم! یہ گفتگو کسی بادشاہ کی نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ شخصیت واقعی نبی ہے۔ اور جو اس نے کہا ہے وہ سچ ثابت ہوگا۔ اور اگر اس کی خبر کی تصدیق ہو جاتی ہے تو بلاشبہ وہ نبی ہے اور اگر اس خبر کی تصدیق نہیں ہوتی تو پھر ہم اس کے معاملہ کو دیکھیں گے۔

اسی دوران باذان کے پاس شیرویہ کا خط پہنچا۔ جس میں لکھا تھا کہ میں نے

اپنے باپ کسریٰ کو اہل فارس سے اس کی بدسلوکی، ذلت آمیز رویے، اور شرفاء کے قتل کی پاداش میں ہلاک کر دیا ہے۔ میرا یہ خط ملنے پر میری اطاعت اور فرماں برداری کرو اور میری حکومت تسلیم کرو۔ اور ہاں! جس شخص کے بارے میں میرے باپ نے تمھیں لکھا تھا کہ اسے گرفتار کر کے پیش کرو اس کے معاملے کو میرے اگلے حکم تک مؤخر کر دو۔ باذان نے شیرویہ کا یہ مکتوب پڑھا تو بے اختیار کہنے لگا: یہ مدینے والا شخص بلاشبہ اللہ کا رسول ہے، چنانچہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کی اولاد اور دیگر فارسی لوگ جو وہاں مقیم تھے وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے'' کہ قہرمان نے باذان سے ایک بڑی عجیب بات کہی۔

اس نے کہا: میں بڑا مشہور سفارت کار ہوں۔ آج تک میں کسی سے گفتگو کرتے ہوئے مرعوب نہیں ہوا۔ مگر جب میں نے محمد (ﷺ) سے بات کی تو میں سخت مرعوب ہو گیا۔ باذان کہنے لگا کہ کیا اُن (ﷺ) کے پاس پولیس، خدم وحشم یا محافظوں کی فوج تھی؟۔ کہنے لگا: نہیں، بالکل نہیں۔ اُن کے پاس ایک محافظ بھی نہیں تھا۔[1]

اللہ کے رسول ﷺ نے کسریٰ کی حکومت کے پارہ پارہ ہونے کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی وہ من وعن پوری ہوئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بیٹے کی حکومت محض چھ ماہ تک چلی۔ اس کے بعد چار سال کے عرصے میں دس

---

[1] البداية والنهاية :4/265.

بادشاہ اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھے بالآخر لوگوں نے یزدگرد پر اتفاق کیا۔ جس نے حکومت سنبھالی۔ یہ بنی ساسان کا آخری بادشاہ تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ایران فتح کر لیا۔

امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا: (إِذَا هَلَكَ كِسْرىٰ فَلَا كِسْرىٰ بَعْدَهُ) ''جب یہ کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا۔''[1] (وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتُنْفَقَنَّ كُنُوزُهُمَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ) ۔''اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ان کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے۔''[2] امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسریٰ کے پاس اللہ کے رسول کا نامہ مبارک پہنچا تو اس نے اسے چاک کر دیا اور اللہ نے اس کی حکومت پارہ پارہ کر دی۔ مگر اس وقت کی دوسری بڑی طاقت کے سربراہ قیصر کے پاس نامۂ مبارک گیا تو اس نے اس کا احترام کیا۔ اسے چوما، اور خوشبو میں بسایا (وَضَعَهُ فِي مَسْكٍ) ۔ ''چمڑے کی تھیلی میں محفوظ کر لیا۔'' تو اس کی حکومت بچ گئی۔[3]

صحیح مسلم میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول (ﷺ) نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ (لَتَفْتَحَنَّ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ أَوْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ كَنْزَآلِ كِسْرىٰ الَّذِي فِي الْأَبْيَضِ) ''مسلمانوں کی ایک

---

[1] صحيح البخاري حديث: 3120 صحيح مسلم، حديث: 2919.

[2] حوالہ سابقہ۔

[3] دلائل النبوة للبيهقي: 4/393.

جماعت کسریٰ کے خزانے اس کے سفید محل میں کھولے گی۔''[1]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں اور میرے والد اس جماعت میں شامل تھے جنھوں نے کسریٰ کے خزانے کھولے۔ اور ہمیں ان میں سے ایک ہزار درہم بھی دیے گئے۔[2]

قارئین کرام! اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے وعدے کا ایفا فرمایا اور باذان کو اسلام قبول کرنے کے بعد یمن کی حکمرانی پر فائز رکھا۔

---

1 صحیح مسلم، حدیث: 2919، ومسند أحمد: 89/5.
2 دلائل النبوة للبیهقي: 389/4.

83

ضعیفوں کا ملجا، غریبوں کا ماویٰ ﷺ

جب اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور حکام کو مکاتیبِ مبارک ارسال فرمائے تو ان پر اپنی مہر ثبت فرمائی جس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ ایک نامۂ مبارک روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس ارسال فرمایا۔ اس گرامی نامہ کو پہنچانے کے لیے دحیہ بن خلیفہ کلبی کا انتخاب ہوا۔ نامۂ مبارک پہنچا تو ہرقل نے حکم دیا کہ کسی ایسے قریشی کو تلاش کیا جائے جو مکہ سے آیا ہو۔ اتفاق سے اس وقت ابوسفیان وہاں موجود تھے۔ انہیں ہرقل کے روبرو پیش کیا گیا۔ ابوسفیان ہرقل کے پاس بیٹھ گئے۔ ہرقل کا ان سے ایک لمبا مکالمہ ہوا جس میں بہت سے سوال و جواب ہوئے۔ ایک سوال یہ تھا: کیا اس نبی ﷺ کے متبعین کی اکثریت امیر لوگوں کی ہے یا غریب لوگوں کی؟ جواب ملا کہ ضعیف اور کمزور لوگوں کی اکثریت ہے۔ ہرقل کہنے لگا کہ (وَهُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ) ''پیغمبروں کے متبعین اسی طرح کے لوگ

ہوتے ہیں۔"[1] اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: (أَبْغُونِي ضُعَفَاءَ كُمْ فَإِنَّمَا تُرْزَقُونَ وَتُنْصَرُونَ بِضُعَفَائِكُمْ) "مجھے ضعیفوں میں تلاش کرو، تمھیں ان ہی کمزوروں اور ضعیفوں کی بدولت رزق اور فتح حاصل ہوتی ہے۔"[2]

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ مدینہ کی بوڑھی عورتوں کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے، ان کی مشکلات، مسائل اور پریشانیاں پوچھتے، ان کے پاس بیٹھتے اور ان کے مسائل حل فرماتے۔ کبھی کبھار کوئی اعرابی راستہ میں روک لیتا اور اپنی حاجت بیان کرتا تو آپ ﷺ اس کی دلداری فرماتے تھے۔

بچوں کو اپنی گود میں لے لیتے، ان سے پیار کرتے اور ان سے کھیلتے تھے، فقیر اور مسکین لوگ آپ ﷺ کا مبارک ہاتھ پکڑ لیتے، جہاں چاہتے لے جاتے اور عالم انسانیت کی سب سے بڑی شخصیت ﷺ اعلیٰ ترین اخلاق کے حامل امام الانبیاء ﷺ ان لوگوں کے مصائب کا مداوا بن جاتے۔ رب تعالیٰ نے بھی ان کی شان اس طرح بیان فرمائی: ﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ "بلاشبہ آپ حسن اخلاق کے بلند ترین منصب پر فائز ہیں۔"[3]

---

1. صحیح البخاري، حدیث: 7.
2. سنن أبي داود، حدیث: 2594.
3. القلم 68:4.

84

حرم پاک کی بے حرمتی کا انجام

صلح حدیبیہ کی جملہ شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی قبیلہ مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان میں شامل ہونا چاہے تو بخوشی ہوسکتا ہے اور وہ ان کا حصہ سمجھا جائے گا، چنانچہ بنوخزاعہ مسلمانوں کے ساتھ اور بنوبکر کفار کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان دونوں قبیلوں میں مدتوں سے باہمی دشمنی اورلڑائیاں چلی آ رہی تھیں۔ اس معاہدہ کے تحت وہ دونوں ایک دوسرے سے بے خطر اور محفوظ ہو گئے۔

ادھر بنوبکر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور بنوخزاعہ سے پرانا بدلہ لینا چاہا، چنانچہ انھوں نے رات کی تاریکی میں بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے بنوبکر کی نہ صرف اسلحہ سے مدد کی بلکہ ان کے آدمی عملاً لڑائی میں شریک بھی ہوئے۔ بنوبکر کی قیادت نوفل بن معاویہ کر رہا تھا۔ یہ شعبان آٹھ ہجری کی بات ہے۔ بنوخزاعہ حرم میں داخل ہو گئے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی حرم کا تقدس موجود تھا۔ حدود حرم میں دشمنوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ لڑائی سے ہاتھ روک لیے جاتے تھے، چنانچہ بنوبکر نے نوفل سے کہا کہ اب ہم حدود حرم میں داخل ہوگئے ہیں۔ اپنے اللہ سے

ڈرو...... اپنے الٰہ سے ڈرو۔ نوفل کی زبان سے ایک بڑی غلط اور گستاخی کی بات نکل گئی۔ اس نے کہا بنو بکر! آج کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اپنا بدلہ لے لو۔ میری عمر کی قسم! تم لوگ حرم میں چوری کرتے ہو تو کیا حرم میں اپنا بدلہ نہیں لے سکتے، چنانچہ بنوخزاعہ کے متعدد افراد مارے گئے، کچھ بھاگ گئے۔ ان میں سے عمرو بن سالم خزاعی نے مدینہ کا رخ کیا اور اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اشعار کی صورت میں دہائی دی۔ بنو بکر اور ان کے حلیف قریشیوں کے ظلم کی داستان سنائی۔ بنو خزاعہ اور بنو ہاشم کے درمیان عہد و پیمان آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے زمانے ہی سے چلا آ رہا تھا۔ عرب زبان و بیان کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ عمرو بن سالم کی شاعری اور اس میں مظلومیت کا روح فرسا تذکرہ سُنا تو اللہ کے رسول ﷺ نے فوراً فیصلہ سنا دیا کہ تم لوگوں کی مدد کی جائے گی، پھر دوسرا وفد بھی آیا۔ اس نے بھی لڑائی کی تفصیلات اور نقصانات سے آگاہ کیا۔ یہ قریش کی طرف سے کھلی بدعہدی اور معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں کوئی ایک منظور کی جائے۔

- مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔
- قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔
- اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔

قرطہ بن عبد عمرو نے قریش کی طرف سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔

قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو اپنے عاجلانہ فیصلے کی غلطی کا احساس ہوا۔ انھوں نے مجلس مشاورت بلائی۔ طے پایا کہ ابوسفیان تجدید صلح کے لیے مدینہ جائیں، چنانچہ ابوسفیان مدینہ روانہ ہوا۔ راستے میں خزاعی وفد کے سردار بُدیل سے ملاقات ہوئی۔ بدیل اللہ کے رسول ﷺ کو ظلم کی داستان سنا کر واپس مکہ جا رہا تھا۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ کیا تم محمد ﷺ کے پاس گئے تھے؟ اس نے کہا نہیں۔ جب بدیل چلا گیا تو ابوسفیان نے اس کے اونٹ کی مینگنی اُٹھائی۔ اُسے توڑا تو اس میں کھجور کی گٹھلی نظر آئی۔ اس نے کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بُدیل محمد ﷺ کے پاس گیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ابوسفیان مدینہ میں سیدھا اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر گیا یہ اللہ کے رسول ﷺ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ گھر میں داخل ہوا تو سامنے اللہ کے رسول ﷺ کا بستر لگا ہوا تھا۔ وہ اس پر بیٹھنے لگا تو ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے آگے بڑھ کر بستر لپیٹ دیا۔

ابوسفیان کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے چونک کر اپنی بیٹی سے پوچھا: کیا تم نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا یا مجھے اس بستر کے قابل نہیں جانا۔ انھوں نے کہا: جی ہاں! یہ اللہ کے رسول ﷺ کا بستر ہے۔ آپ ناپاک مشرک ہیں، لہٰذا آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں۔ ابوسفیان کے لیے یہ بات بڑے تعجب کا باعث تھی۔ اسے اپنی ہی بیٹی سے اس قسم کے سلوک کی ہرگز اُمید نہ تھی۔ کھسیانا ہو کر کہنے لگا: خدا کی قسم! میرے بعد تمھیں شر پہنچ گیا ہے، پھر وہ اللہ کے رسول کے پاس گیا، اپنا مدعا بیان کیا۔ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ابوبکر صدیق کے

پاس گیا کہ سفارش کریں۔ انھوں نے انکار کر دیا، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے لکڑی کا ایک ٹکڑا بھی دستیاب ہو گا تو میں تم سے اسی کے ساتھ لڑائی کروں گا۔ اب وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر آیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی وہیں تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی رشتہ داری کا واسطہ اور حوالہ دیا اور درخواست کی تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے میری سفارش کرو۔ انھوں نے بھی نفی میں جواب دیا تو وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف متوجہ ہوا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے۔ ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا: اگر یہ بچہ اپنی زبان سے اتنا کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بچوں کو ان معاملات سے کیا واسطہ؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر ابوسفیان کو کوئی پناہ بھی نہیں دے سکتا۔ ابوسفیان نے بے بسی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اسے مشورہ دیا کہ تم لوگوں کے درمیان امان کا اعلان کر کے واپس چلے جاؤ، چنانچہ ابوسفیان نے مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ میں لوگوں کے درمیان امان کا اعلان کر رہا ہوں، پھر وہ واپس مکہ چلا آیا۔ وہاں لوگوں نے اُس سے پوچھا: سناؤ کیا گزری؟ اس نے ساری بات سنا دی لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور کہا۔ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو تم سے مذاق کیا ہے۔ وہ کھسیانا ہو گیا۔ کہنے لگا: اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔[1]

[1] البدایۃ والنھایۃ:4/273-275، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام:4/31-39.

جحفہ میں یا اس سے آگے آپ ﷺ کو چچا حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ملے۔ وہ مسلمان ہو کر اپنے بال بچوں سمیت ہجرت کر کے تشریف لا رہے تھے۔ آگے آپ ﷺ کے چچیرے بھائی ابوسفیان اور پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن اُمیہ ملے۔ آپ نے ان دونوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ کیونکہ یہ دونوں آپ کو سخت اذیت پہنچایا کرتے اور آپ کی ہجو کرتے تھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ آپ ﷺ کے چچیرے بھائی اور پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان بن حارث کو سکھایا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے سامنے جاؤ اور وہی کہو جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان سے کہا تھا کہ ''اللہ کی قسم! اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی اور یقیناً ہم خطا کار تھے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنا سفر جاری رکھا۔ آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم روزے سے

تھے لیکن عسفان اور قُدَید کے درمیان کَدید نامی چشمے پر پہنچ کر آپ ﷺ نے روزہ توڑ دیا۔ اور آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام نے بھی روزہ توڑ دیا۔ ابوسفیان باہر جا جا کر خبروں کا پتا لگاتا رہتا تھا، چنانچہ اس وقت بھی وہ، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء خبروں کی سُن گُن لینے کی غرض سے نکلے ہوئے تھے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کی آواز پہچان لی اور کہا: ابوحنظلہ؟ اس نے بھی میری آواز پہچان لی اور بولا: ابوالفضل؟ میں نے کہا: ہاں! اور وہ بولا: کیا بات ہے میرے ماں باپ تجھ پر قربان!...... میں نے کہا: ادھر رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے ہیں لوگوں سمیت۔ ہائے قریش کی تباہی واللہ! ۔تم اس خچر پر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلتا ہوں اور تمھارے لیے امان طلب کیے لیتا ہوں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ابوسفیان کو لے کر چلا۔ جب کسی الاؤ کے پاس سے گزرتا تو لوگ کہتے: کون ہے؟ مگر جب وہ دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ کا خچر ہے تو راستہ چھوڑ دیتے۔ یہاں تک کہ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اَلاؤ کے پاس سے گزرا۔ اس کے بعد وہ نکلے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑے۔

بولے: اللہ کے رسول ﷺ! یہ ابوسفیان ہے۔ مجھے اجازت دیجیے میں اس کی گردن اُڑا دوں۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے اسے پناہ دے دی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عباس! اسے ......، یعنی ابوسفیان کو...... اپنے خیمے

میں لے جاؤ۔ صبح میرے پاس لے آنا۔ اس حکم کے مطابق میں اسے اپنے خیمے میں لے گیا اور صبح اُسے خدمتِ نبوی ﷺ میں پیش کر دیا۔ آپ ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا: ابوسفیان! تم پر افسوس، کیا اب بھی تمھارے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ تم یہ جان سکو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں؟ ابوسفیان نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا! آپ کتنے بردبار، کتنے کریم اور کتنے خویش پرور ہیں۔ میں خوب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہوتا تو اب تک یقیناً میرے کسی کام آیا ہوتا۔...... الغرض، ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا اور حق کی شہادت دی۔[1]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: 4/285,284.

86

حق آ گیا...... باطل مٹ گیا

منگل 17 رمضان 8 ہجری کی صبح رسول اللہ ﷺ مر الظہران سے مکہ روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ابوسفیان کو راستے میں پہاڑ کے ناکے پر روک کر رکھا جائے تاکہ وہ وہاں سے گزرنے والی خدائی فوجوں کو دیکھ سکے۔

انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ وہ ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو بولے:

(اليومُ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ اَلْيَوْمَ تُستَحَلُّ الحُرْمَةُ)

''آج خونریزی اور مار دھاڑ کا دن ہے۔ آج حرمت حلال کرلی جائے گی آج اللہ نے قریش کی ذلت مقدر کردی ہے۔''

اس کے بعد جب وہاں سے رسول اللہ ﷺ گزرے تو ابوسفیان نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ نے وہ بات نہیں سنی جو سعد نے کہی ہے؟ آپ نے دریافت فرمایا: سعد نے کیا کہا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: انھوں نے ایسی ایسی

(ہولناک) باتیں کہی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا: نہیں بلکہ آج کا دن تو وہ دن ہے جس میں کعبہ کی تعظیم کی جائیگی۔ آج کا دن وہ دن ہے جس میں اللہ قریش کو عزّت بخشے گا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیج کر ان سے جھنڈا لے لیا اور ان کے صاحبزادے قیس کے حوالے کر دیا۔

ابوسفیان تیزی سے بھاگا۔ مکہ پہنچا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا: قریش کے لوگو! یہ محمد ﷺ ہیں۔ تمھارے پاس اتنا بڑا لشکر لے کر آئے ہیں کہ مقابلے کی تاب نہیں، لہٰذا جو ابوسفیان کے گھر آ جائے اسے امان ہے۔ یہ سن کر اس کی بیوی ہند بنت عتبہ بڑے طیش میں اٹھی اور اس کی مونچھ پکڑ کر بولی: مار ڈالو اس مشک کی طرح چربی سے بھرے ہوئے پتلی پنڈلیوں والے کو۔ معلوم نہیں یہ کیا بک رہا ہے۔ ہندہ نے اپنے شوہر کو اور بھی بہت کچھ بُرا بھلا کہا۔ لوگ سٹپٹا کر جمع ہو گئے کہ خدا جانے ان دونوں کو کیا ہو گیا۔

ابوسفیان نے کہا: تمھاری بربادی ہو۔ محمد ﷺ ایسا لشکر لے کر آئے ہیں جس سے مقابلے کی کسی کو تاب نہیں۔

ادھر رسول اللہ ﷺ ''مر الظہران'' سے روانہ ہو کر ''ذی طویٰ'' پہنچے۔ اس دوران آپ ﷺ نے اللہ کے بخشے ہوئے اعزازِ فتح پر فرطِ تواضع سے اپنا سر جھکا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی کے بال کجاوے کی لکڑی سے جا لگے تھے۔

ذی طویٰ میں آپ نے لشکر کی ترتیب و تقسیم فرمائی۔ خالد بن ولید کو داہنے پہلو پر رکھا کہ وہ مکہ میں زیریں حصے سے داخل ہوں۔ اگر قریش میں سے کوئی آڑے

آئے تو اسے کاٹ کر رکھ دیں۔ یہاں تک کہ آپ سے صفا پر آملیں۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ پیادے پر مقرر تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی راہ میں جو مشرک بھی آیا اسے موت کی نیند سلا دیا گیا، خندمہ کے مقام ایک جھڑپ میں بارہ (12) مشرک مارے گئے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے اور آگے پیچھے اور دائیں بائیں موجود انصار ومہاجرین کے ہجوم میں مسجد حرام کے اندر تشریف لے گئے۔ آگے بڑھ کر حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد بیت اللہ کا طواف کیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ بیت اللہ میں اور اسکے اردگرد تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے۔ آپ اسی کمان سے ان بتوں کو ٹھُکراتے اور ضرب لگاتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:

﴿ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل یقیناً مٹ جانے والی چیز ہے۔''

اس صدائے مقدس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمان کی ضرب سے بُت مُنہ کے بل گرتے جاتے تھے۔

آپ نے طواف اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر فرمایا اور حالتِ احرام میں نہ ہونے کی وجہ سے صرف طواف ہی پر اکتفا کیا۔ تکمیلِ طواف کے بعد حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ ان سے کعبہ کی کنجی لی، پھر آپ کے حکم سے خانہ کعبہ کھولا گیا۔ [1]

---

[1] البداية والنهاية :4/285-296 (مُلخصًا) والسيرة النبوية لابن هشام: 4/42-55.

87

تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی

قریش (سامنے) مسجد حرام میں صف در صف کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ انھیں انتظار تھا کہ دیکھیں اب آپ ﷺ کیا کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے دروازے کے دونوں بازو تھام لیے۔ قریش نیچے کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے خطاب فرمایا:

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور تنِ تنہا سارے جتھوں کو شکست دے دی۔ سنو! بیت اللہ کی کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ سارا اعزاز وکمال اور جاہلیت کا خون میرے ان دونوں قدموں تلے ہے۔ یادرکھو، قتل خطا شبہ عمد میں، جو کوڑے یا ڈنڈے سے ہو، مغلظ دیت ہے، یعنی سو اونٹ جن میں سے چالیس اونٹنیوں کے شکموں میں ان کے بچے ہوں۔ [1]

آپ ﷺ نے مزید فرمایا: قریش کے لوگو! تمھارا کیا خیال ہے۔ میں تمھارے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟ وہ سب بیک زبان بولے: آپ اچھا ہی کریں

[1] مسند أحمد: 187/2.

گے۔ آپ کریم بھائی ہیں۔ اور کریم بھائی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو میں تم سے وہی بات کہہ رہا ہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ [1]

اب نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبے پر چڑھو اور اذان کہو!

اس وقت ابوسفیان بن حرب، عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام کعبہ کے صحن میں بیٹھے تھے۔ عتاب نے کہا: اللہ نے اسید کو یہ شرف بخشا کہ وہ پہلے ہی فوت ہوگئے تھے۔ انھوں نے یہ (اذان) نہ سنی، ورنہ انھیں ایک ناگوار چیز سُننی پڑتی۔ اس پر حارث نے کہا: سنو! واللہ! اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ حق پر ہیں تو میں ان کا پیروکار بن جاؤں گا۔ اس پر ابوسفیان نے کہا: دیکھو! واللہ! میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ اگر میں بولوں گا تو یہ کنکریاں بھی میرے بارے میں خبر دے دیں گی۔ اس کے بعد نبی ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: تم لوگوں نے ابھی جو باتیں کی ہیں، ان کی اطلاع مجھے مل چکی ہے، پھر آپ نے ان کی گفتگو دہرادی۔ اس پر حارث اور عتاب بول اٹھے: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ اللہ کی قسم! کوئی اور شخص ہمارے پاس تھا ہی نہیں جو ہماری اس گفتگو سے آگاہ ہوتا اگر ہمارے ساتھ کوئی اور آدمی ہوتا تو ہم سمجھتے کہ اسی شخص نے آپ کو اطلاع دی ہوگی۔ [2]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 4/55,54.

[2] البداية والنهاية: 4/298، والسيرة النبوية لابن هشام: 4/56.

سفاکوں نے تائب ہو کر نئی زندگی کا آغاز کیا

اسی روز رسول اللہ ﷺ اُمّ ہانی بنت ابی طالب کے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں غسل فرمایا اور ان ہی کے گھر میں آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ یہ چاشت کا وقت تھا، اس لیے کسی نے اسے چاشت کی نماز سمجھا اور کسی نے فتح کی نماز۔ اُمّ ہانی نے اپنے دو دیوروں کو پناہ دے رکھی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ام ہانی! جسے تم نے پناہ دی اسے ہم نے بھی پناہ دی۔ آپ ﷺ نے یہ تسلی اس لیے دی کہ اُم ہانی کے بھائی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان دونوں کو قتل کرنا چاہتے تھے، اس لیے ام ہانی نے ان دونوں کو چھپا کر گھر کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ نبی ﷺ ان کے ہاں تشریف لے گئے تو محترمہ ام ہانی رضی اللہ عنہا نے دیوروں کے بارے میں سوال کیا اور مذکورہ جواب سے سرفراز ہوئیں۔[1]

عکرمہ بن ابی جہل مکہ سے نکل بھاگا، اس نے یمن کی راہ لی۔ لیکن اس کی بیوی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور شوہر کے لیے امان کی درخواست کی۔

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 357، وصحیح مسلم، حدیث: 336.

آپ ﷺ نے اسے امان دے دی۔ اس کے بعد وہ عکرمہ کے پیچھے بھاگی اور اسے ساتھ لے آئی۔ اس نے واپس آ کر اسلام قبول کیا اور اس کے اسلام کی کیفیت بہت اچھی رہی۔ [1]

ہَبَّار بن اسود وہی شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو ان کی ہجرت کے موقع پر ایسا کچوکا مارا تھا کہ وہ ہودج سے گر کر ایک چٹان پر جا پڑی تھیں اور اس سانحے کی وجہ سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ یہ شخص بھی فتح مکہ کے روز نکل بھاگا، بالآخر مسلمان ہو گیا۔ اس کے اسلام کی کیفیت بھی اچھی رہی۔ [2]

ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بھیس بدل کر آئی۔ اس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش سے جو وحشیانہ سلوک کیا تھا اس کی وجہ سے وہ خوف زدہ تھی کہ مبادا رسول اللہ ﷺ اسے پہچان لیں۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے بیعت شروع کی تو فرمایا: میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی بات دہراتے ہوئے عورتوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور چوری نہ کرو گی۔ اس پر ہندہ بول پڑی کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ اگر میں اس کے مال میں سے کچھ لے لوں تو؟ ابوسفیان (جو وہیں موجود تھے۔) وہ معاً بولے: تم جو کچھ لے چکی ہو وہ تمھارے لیے میری طرف سے حلال ہے۔ یہ سُن کر رسول

[1] الرحیق المختوم، ص: 538.

[2] الرحیق المختوم، ص: 539.

اللہ ﷺ مسکرانے لگے۔ آپ نے ہندہ کو پہچان لیا۔ فرمایا: اچھا...... تو تم ہو ہندہ؟ وہ بولی: جی ہاں، اے اللہ کے نبی! بیتے دنوں میں جو کچھ ہو چکا ہے اسے معاف فرما دیجیے۔ اللہ آپ کو معاف فرمائے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اور زنا نہ کرو گی۔ اس پر ہندہ نے کہا: بھلا کہیں حُرَّہ (آزاد عورت) بھی زنا کرتی ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی۔ ہندہ نے کہا: ہم نے تو بچپن میں انھیں پالا پوسا لیکن وہ بڑے ہوئے تو آپ لوگوں نے انھیں قتل کر دیا، اس لیے آپ اور وہ ہی بہتر جانیں- یاد رہے کہ ہندہ کا بیٹا حنظلہ بن ابی سفیان بدر کے دن قتل کر دیا گیا تھا- یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قدر ہنسی آئی کہ ہنستے ہنستے چت لیٹ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے لب ہائے مبارک پر بھی تبسم نمودار ہو گیا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اور کوئی بہتان نہ گھڑو گی۔ ہندہ نے کہا: واللہ! بہتان بڑی بُری بات ہے۔ آپ ﷺ ہمیں واقعی سیدھی اور سچی راہ اور مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کسی معروف میں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہ کرو گی۔ ہندہ نے کہا: اللہ کی قسم! ہم اس مجلس میں اس نیت سے نہیں آئیں کہ آپ ﷺ کی نافرمانی بھی کریں گی۔

ہندہ نے اس مقدس مجلس سے واپس جاتے ہی اپنا بُت توڑ دیا۔ وہ بُت کو توڑتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی: (ارے کمبخت) ہم تو تیرے بارے میں دھوکے میں ہی مبتلا رہے۔[1]

---

[1] البدایۃ والنھایۃ: 4/312-314، والرحیق المختوم، ص: 542,541.

89

ایسا فاتح چشم فلک نے کہاں دیکھا ہوگا

8 ہجری 20 رمضان المبارک کو اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء کو فتح مندی کا تاج پہنایا اور رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ ذرا چشم تصور سے قریش کے سرکش متکبر و مغرور، تنومند دیوہیکل جوانوں کو دیکھیے، ان کے مددگاروں کی طرف نظر دوڑائیے کہ آج کس طرح ذلیل و خوار ہو کر جان کے خوف سے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کون کون سے ظلم و ستم اور جرائم و ذمائم ہیں جو ان سفاک لوگوں نے نہیں کیے تھے۔ یہ سب لوگ صفا پہاڑی کے دامن میں کھڑے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے۔ اسی بیت اللہ میں، جہاں سے نکالے گئے تھے، بیت اللہ کا طواف شروع کیا۔ اس گھر میں تین سو ساٹھ بت ہیں۔ کعبہ بتوں سے گھرا ہوا ہے اور آپ ﷺ فرما رہے ہیں:

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (الإسراء: ۸۱)

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا کہ باطل تو مٹنے ہی کے لیے ہے۔''

بتوں کو ان جھوٹے معبودوں کو توڑا جا رہا ہے۔ وہ پاش پاش ہو کر گر رہے ہیں، ریزہ ریزہ ہو رہے ہیں اور اس عمل کے ساتھ ہی قریش کا غرور و تکبر بھی پاش پاش ہو رہا ہے۔ آج کعبہ کے درودیوار اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج رہے ہیں۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کی گونج پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچ رہی ہے۔ آج ہر طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا پھریرا لہرا رہا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کی خوشی میں آٹھ رکعت نماز ادا کر رہے ہیں۔ اپنے وحدہ لاشریک اور طاقتور رب کے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ اس کا شکر ادا کر رہے ہیں۔

مکہ والوں کی نگاہیں خوف کے مارے زمین پر گڑی ہوئی ہیں اور دلوں میں یہ اندیشے موجزن ہیں کہ اب ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟

اعلان ہوتا ہے: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے امان ملے گی، جو بیت اللہ میں آ گیا اس کے لیے بھی امن ہے اور جو اپنے گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا اُسے بھی امان مل جائے گی۔

پھر ایک دل نواز نورانی آواز آتی ہے: مکہ والو! اسلام لے آؤ، سلامتی پا جاؤ گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس اعلان کرتی ہے:

''اکیلے رب کی بادشاہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں، جس نے اپنے

وعدے کو سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام گروہوں کو اُسی وحدہ لاشریک نے شکست فاش دی۔"

بھرپور انکسار کے ساتھ اعلان ہوا: سنو! بیت اللہ کی کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے سوا تمام اعزازات، کمالات اور خون کے دعاوی میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں۔

پھر نظریں جھکائیں اور قریش سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے قریش کے لوگو! جانتے ہو میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟"

جواباً صدا اُٹھی:

"آپ سے خیر اور بھلائی کی امید ہے۔ آپ رحم و کرم والے بھائی ہیں اور رحم و کرم فرمانے والے بھائی کے بیٹے ہیں۔"

رحم طلب جذبوں سے بھیگی اِس صدا کے جواب میں رحمۃ للعالمین ﷺ نے فرمایا:

"...... اس موقع پر...... میں وہی کچھ کہوں گا جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: آج تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ! تم سب آزاد ہو۔"

نبی کریم ﷺ نے کعبہ کے گرد طواف کے سات چکر لگائے، پھر بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔

بنو بکر سے تعلق رکھنے والا حماس بن قیس، مکہ کا ایک مشرک تھا۔ وہ کئی روز سے

اپنے ہتھیار تیار کر رہا تھا تا کہ رحمت عالم اور ان کی سپاہ کا مقابلہ کر سکے۔ فتح مکہ کے دن صبح سویرے اپنی بیوی سے کہنے لگا: آج میں محمد کے ساتھیوں میں سے ایک کو تمھارے لیے غلام بنا کر لاؤں گا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بڑی سراسیمگی اور حواس باختگی کی حالت میں گھر پہنچا، کہا: نیک بخت! جلدی سے دروازہ بند کر دے!

بیوی نے طنزاً کہا: ارے! وہ تمھارا غلام کہاں ہے؟

وہ بولا:

''اے نیک بخت! اگر تم نے جنگ خندمہ کا حال دیکھا ہوتا جبکہ صفوان اور عکرمہ جیسے جری سردار بھاگ کھڑے ہوئے اور سونتی ہوئی تلواروں سے ہمارا استقبال کیا گیا، جو کلائیاں اور کھوپڑیاں یوں کاٹ رہی تھیں کہ پیچھے سوائے ان کے شور وغوغا اور آہ وفغاں کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا، تو تم مجھ سے ادنیٰ سی ملامت کی بات بھی نہ کرتیں۔''

اور پھر لوگوں نے بہت حیرت واستعجاب سے یہ منظر دیکھا کہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا قاتل وحشی بن حرب پیش ہوا۔ یہ فتحِ مکہ کے دن سوئے طائف بھاگ نکلا۔ اب وہ اپنے خاندان کے ساتھ اس حال میں پیش ہوا کہ کلمہ طیبہ زبان پر جاری تھا۔ اور رسالت مآب ﷺ سے امن، پناہ اور جان بخشی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وحشی آیا ہے؟

عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ!

ارشاد ہوا: ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے میرے پیارے چچا کو کیسے شہید کیا تھا؟

جب اس نے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

ارشاد ہوا: وحشی! مجھ سے اپنا چہرہ دور کر لو!

سید الشہداء چچا سے بدرجۂ غایت محبت کے باوجود نبی رحمت ﷺ نے اپنے چچا کے قاتل کا اسلام بھی قبول فرمایا اور اسے معاف کر دیا۔ کیا تاریخ نے عفو و درگزر اور رحم و کرم کی ایسی مثال کبھی دیکھی ہے؟ یہ سوال قیامت تک دامن پھیلائے کھڑا رہے گا مگر تاریخ کی جھکی ہوئی پیشانی اس کا جواب کبھی نہ دے سکے گی۔[1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:4280و4287، والبدایة والنھایة: 4/287-300.

90

سید الشہداء کا جگر چبانے والی رحمت عالم کے روبرو

فتح مکہ کے روز جب عام معافی کا اعلان ہوا تو اہل مکہ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ ٹولیوں کی شکل میں آنے لگیں۔ انہی میں چھپتے چھپاتے ہند بنت عتبہ بھی آئی، سید الکونین کے عم محترم سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش مبارک کے ساتھ اس کا انسانیت سوز کردار بالکل عیاں تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت تکلیف دینا، اس کا مقصد حیات تھا۔ اس کے جرائم بے حد بھیانک، خوفناک اور ناقابل معافی تھے مگر بارگاہِ نبوت میں اس کا اسلام بھی قبول ہوا اور اُسے معاف کر دیا گیا۔

ہند بنت عتبہ عفو و درگزر کے اس مظاہرے سے اس قدر متاثر ہوئی کہ کفر و شرک اور بتوں سے اس کی محبت کا طلسم پاش پاش ہو گیا۔ بتوں کے بارے میں اُس کی نگاہوں پر پڑا ہوا پردۂ فریب چاک ہوا۔ وہ دولت اسلام سے مالا مال ہو

کر گھر واپس گئی۔ بتوں کو حقارت سے دیکھا، پھر انہیں توڑنے لگی۔ بتوں کو توڑتی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ کہتی جاتی تھی: ہائے بدبختو! ہم تمھارے بارے میں کتنے دھوکے میں مبتلا تھے، اس نے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں بکری کے دو بچے بطور ہدیہ ارسال کیے، عرض کیا: ہماری بکریاں بہت کم بچے دے رہی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی تو بہت زیادہ بکریاں ہو گئیں۔ محتاجوں کو بکریاں دیتی اور کہتی: یہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت سے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اسلام کی دولت بخشی۔

فتح مکہ تاریخ اسلامی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ اس روز اللہ نے اسلام کی عزت کو چار چاند لگائے، کفر و شرک پر کاری ضرب لگی۔ بیت اللہ میں اللہ کا کلمہ گونجا اور حرم مکی کو مشرکین سے اور ان کے معبودان باطلہ سے پاک کر دیا گیا۔ اس دن عفو و درگزر کی وہ نادر مثالیں قائم ہوئیں کہ تاریخ انسانی ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کیا تاریخ عالم نے کوئی ایسا مشفق اور عالی ظرف قائد دیکھا ہے؟[1]

---

[1] تاریخ الطبري: 174/3، وأسد الغابة: 281/7، والإصابة في تمييز الصحابة: 426,425/4.

91

ابو وہب! وقت آ گیا ہے کہ تم نیچے اتر آؤ

صفوان بن امیہ مکہ کے بڑے سرداروں میں سے ایک تھا۔ جس کا عمیر بن وہب سے معاملہ ابھی گزرا ہے۔ بدر کے قیدیوں میں صفوان کا والد امیہ بن خلف اور بھائی علی بھی تھے۔ انہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے گرفتار کیا تھا جو زمانہ جاہلیت میں ان کے دوست تھے۔

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ جاہلیت میں میرا نام عبد عَمرو تھا، جب میں مسلمان ہوا تو میں نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ امیہ نے کہا: دیکھو دوست! میں رحمٰن کو مانتا نہیں اور تم پرانے نام سے پکارے جانے پر جواب نہیں دیتے، کیوں نہ کوئی تیسرا نام رکھ لیا جائے جس کے ذریعے میں تمھیں بلا لیا کروں، پھر اس نے خود ہی کہا: میں تمھیں عبدالالٰہ کہا کروں گا۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں: بدر کے روز میں میدان جنگ سے غنیمت کے طور کچھ زرہیں جمع

کر کے لے جا رہا تھا کہ امیہ نے مجھے آواز دی: عبدالالٰہ! زرہیں پھینک دو اور مجھے گرفتار کر لو۔ میری رہائی کے عوض تمھیں بہت سا مال ملے گا۔ میں نے زرہیں پھینک دیں اور ایک ہاتھ سے امیہ اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بیٹے کو پکڑ کر چلنے لگا۔ اچانک حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نظر ان پر پڑ گئی۔ چلا کر کہنے لگے: ساتھیو! آج یا تو یہ اللہ کا دشمن بچے گا یا میں بچوں گا۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: دیکھو بلال! یہ میرا قیدی ہے۔ مگر انھوں نے انصار کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا اور کہا: یہ رہا کفار کا سرغنہ امیہ بن خلف، اب ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی باقی رہے گا۔ حضرت عبدالرحمٰن کہتے ہیں: اسلامی لشکر کے سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ میں اپنے قیدیوں کا بچاؤ کر رہا تھا۔ مگر ایک آدمی نے تلوار سونت کر اس کے بیٹے کے پاؤں پر ماری۔ وہ تیورا کر گر پڑا۔ بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر امیہ نے اس زور کی چیخ ماری کہ میں نے ایسی چیخ کبھی نہیں سنی تھی۔ میں نے کہا: خدا کی قسم! میں بالکل تمھارے کام نہیں آ سکتا۔ نکل بھاگو۔ مگر اب بھاگنے کی گنجائش کہاں تھی۔ لوگوں نے باپ اور بیٹے دونوں کو تلواروں کی باڑھ پر رکھ لیا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے: اللہ بلال رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، میری زرہیں بھی گئیں اور بلال ہی کی وجہ سے میں قیدیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

امیہ نے اہل اسلام پر جو ظلم و ستم کیے تھے ان کا بدلہ بدر کے میدان میں چکا دیا گیا۔ اس کا بیٹا صفوان فتح مکہ تک اسلام کے خلاف سازشوں اور مخالفتوں میں مشغول رہا، یہ لوگ آج کی اصطلاح میں ''جنگی مجرم'' تھے۔ فتح مکہ کے دن یہ جدہ

کی طرف بھاگ گیا۔ عمیر بن وہب آخر اس کے چچا زاد اور ہمدرد تھے۔ وہ اپنے بیٹے وہب بن عمیر کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور صفوان کے لیے امان طلب کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: صفوان آجائے، اسے امان ہے۔ عمیر نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس کے جرائم بہت زیادہ ہیں، ہوسکتا ہے اسے اعتبار نہ آئے، اس کے لیے کوئی نشانی عطا فرما دیں۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک اور ایک اور روایت کے مطابق اپنا عمامہ اتار کر عمیر کو دے دیا۔ عمیر صفوان کو سمجھا بجھا کر مکہ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ بہت سے لوگوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ صفوان نے سواری پر بیٹھے بیٹھے پوچھا: اے محمد! یہ وہب بن عمیر میرے پاس آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے اور ساتھ ہی سوچ بچار کے لیے دو ماہ کی مہلت بھی دی ہے۔ اس رحیم و شفیق اور سراپا عفو و کرم پیغمبر نے اس کے جواب میں فرمایا: (اِنْزِلْ أَبَا وَهْبٍ) ”اے ابو وہب! سواری سے نیچے اتر آؤ۔“ (اِنْزِلْ وَلَكَ مَسِيرُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ) ”آ جاؤ! تمھیں دو نہیں چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔“ تم اسلام کے بارے میں خوب غور و فکر کر لو۔

صفوان مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد سواری سے نیچے اترا۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ حالت کفر میں حنین کی طرف روانہ ہو گیا۔ غزوہ حنین میں اسلحہ کی اشد ضرورت تھی۔ آپ ﷺ نے اس سے اسلحہ طلب کیا۔ وہ بڑا ہوشیار تھا، کہنے لگا: آپ ﷺ میرے اسلحہ پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا عاریتاً لینا چاہتے

ہیں۔ اب ذرا اللہ کے رسول ﷺ کا محبت بھرا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوا:
(بَلْ طَوْعاً عَارِيَةً مَّضْمُونَةً) تمھاری مرضی اور خوشی سے، عاریتاً لے رہا ہوں۔ یہ اسلحہ گارنٹی کے ساتھ قابل واپسی ہوگا۔ تمھاری مرضی ہے، دو یا نہ دو، صفوان نے اسلحہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو شکست ہو رہی تھی اور ان کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ صفوان کا ماں جایا بھائی کلدہ بن حنبل اس کے پاس آیا۔ اور اس شکست پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا: دیکھو صفوان! آخر یہ طلسم ٹوٹ ہی گیا۔ صفوان نے اسے ٹوکا اور کہا: اپنی زبان کو لگام دو:

(فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَّرُبَّنِي رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ يَّرُبَّنِي رَجُلٌ مِّنْ هَوَازِنَ يَعْنِي عَوْفَ بْنَ مَالِكٍ النَّضْرِيَّ)

''اللہ کی قسم! قریش کا آدمی میرا سردار اور آقا بنے۔ یہ میرے لیے بنی ہوازن کے عوف بن مالک نضری کے غلبے سے کہیں زیادہ بہتر اور محبوب ہے۔''

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جنگ کا پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ گیا اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

صفوان کہتا ہے:

(أَعْطَانِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ حُنَيْنٍ وَإِنَّهُ لَأَبْغَضُ النَّاسِ إِلَيَّ فَمَا زَالَ يُعْطِينِي حَتّٰى إِنَّهُ لَأَحَبُّ النَّاسِ إِلَيَّ)

''میں اللہ کے رسول ﷺ سے شدید بغض رکھتا تھا مگر آپ ﷺ نے

غنیمت سے مجھے بارہا مال عطا کیا۔ وہ مسلسل مجھے مال دیتے رہے۔ مجھے نوازتے رہے حتی کہ وہ میری نگاہوں میں محبوب ترین شخصیت بن گئے۔‘‘

صفوان آپ کے حسن سلوک، حلم، حوصلہ اور فیاضی سے اس قدر متاثر ہوا کہ چار ماہ والی مہلت اور سوچ و بچار کا وقت سکڑ کر تین ہفتہ تک آ گیا اور حنین کے فوراً بعد ختم ہو گیا۔ اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ مکہ پہنچا لوگوں نے اس سے کہا: (مَنْ لَّمْ يُهَاجِرْ هَلَكَ وَلَا إِسْلَامَ لِمَنْ لَّا هِجْرَةَ لَهُ)۔ ’’جس نے ہجرت کا شرف نہ پایا وہ تو برباد ہو گیا بلکہ جس نے ہجرت نہیں کی اس کا تو اسلام ہی قبول نہیں۔‘‘

یہ بات اس کے علم میں آئی تو ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گیا اور آپ ﷺ کے چچا عباس بن عبدالمطلب کا مہمان بنا۔ آپ کو معلوم ہوا تو ارشاد فرمایا: (لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ) ’’فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت ختم ہو گئی ہے۔‘‘ اللہ کے رسول ﷺ اپنے ساتھیوں سے غایت درجہ محبت رکھتے تھے اور ان کے معمولی سے معمولی کاموں میں بھی ذاتی دلچسپی لیتے تھے۔ پوچھا: صفوان کس کے مہمان بنے ہو؟ عرض کیا: آپ ﷺ کے چچا عباس کا۔ فرمایا۔ (نَزَلْتَ عَلَى أَشَدِّ قُرَيْشٍ لِقُرَيْشٍ حُبًّا) ’’صفوان! تم ایک ایسی قریشی شخصیت کے مہمان بنے ہو جو قریش سے شدید محبت رکھتا ہے۔‘‘ پھر فرمایا: ’’ابو وہب! مکہ واپس چلے جاؤ، اپنے ڈیرے ہی پر قیام کرو اور لوگوں کو دین کی دعوت دیتے رہو‘‘، چنانچہ وہ وفات تک مکہ مکرمہ میں ہی مقیم رہے۔

صفوان مکہ کے نہایت ممتاز سرداروں میں سے تھے۔ نہایت فصیح اللسان تھے۔ ان کے خاندان کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ لوگوں کو کھانا کھلانے والے اور خوب مہمان نوازی کرنے والے شرفاء تھے۔ یہ سلسلہ نسلوں سے چلا آرہا تھا۔ ایک دن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے پوچھا: مکہ میں سب سے زیادہ مہمان نواز کون ہے؟ جواب ملا: عبداللہ بن صفوان کہنے لگے: (بَخٍ بَخٍ تِلْكَ نَارٌ لَا تَطْفَأُ) ''اس گھرانے کے مہمان خانے کی آگ کبھی بجھتی ہی نہیں۔'' صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ بیالیس ہجری میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی ایام میں وفات پا گئے اور ان کا بیٹا عبداللہ بن صفوان مکہ مکرمہ میں عبداللہ بن زبیر کی جانب سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔[1]

---

① البداية والنهاية: 318,303,302/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 90,66/4 والتفصيل في أسد الغابة: 26-24/3.

غزوۂ حنین
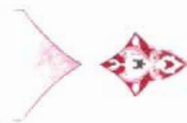
مکہ مکرمہ 8 ہجری میں فتح ہوا۔ یہ خبر اطراف مکہ میں آناً فاناً پھیل گئی۔ یہ معمولی کامیابی نہ تھی۔ طائف میں یہ خبر پہنچی تو وہاں کے بڑے بڑے سردار مالک بن عوف نصری کی قیادت میں مشورہ کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد (ﷺ) جیسے ہی مکہ سے فارغ ہوں گے سیدھے طائف پر چڑھائی کریں گے۔ مالک بن عوف چالیس سال کا تجربہ کار قائد، بڑا بہادر اور نہایت جنگجو شخص تھا۔ اس کے سامنے طائف کے ممتاز جنگجو قبائل ہوازن اور ثقیف کے سردار بیٹھے ہوئے تھے۔ ریاض سے طائف تک آپ سفر کریں تو راستے میں جو چھوٹی موٹی بستیاں آتی ہیں ان میں اکثریت عتیبی قبیلہ کے لوگوں کی ہے۔ یہ ہوازن قبیلہ کے لوگوں کی اولاد ہیں۔ یہ بڑے اڑیل، اکھڑ طاقتور اور متکبر لوگ تھے۔ انھوں نے دوران گفتگو مکہ کے لوگوں کا مذاق اڑایا کہ ان کو جنگ سے

واقفیت نہ تھی، اس لیے مسلمانوں کا تر نوالہ بن گئے اگر مقابلہ ہمارے ساتھ ہوا تو پھر ہم انہیں دیکھ لیں گے۔

قصہ مختصر۔لشکر طائف تیار ہوا۔اس کا کمانڈر انچیف مالک بن عوف ہی کو مقرر کیا گیا۔اس نے اہلِ طائف کو حکم دیا کہ اپنی عورتیں، بچے، جانور، اونٹ بھیڑیں، بکریاں ہر چیز ساتھ لے آئیں اور حنین کے قریب وادی اوطاس میں خیمہ زن ہو جائیں۔ یہ بنو ہوازن کی ایک وادی ہے۔ جنگی نقطہ نظر سے عورتیں، بچے اور مال مویشی میدان جنگ میں لانا نہایت حماقت کی بات تھی۔ درید بن صمہ نامی ایک سردار نے اس کی مخالفت کی۔ مگر وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اُسے کوئی قابلِ التفات نہیں سمجھتا تھا۔مگر اس کے باوجود اس نے مالک بن عوف سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے، میں اونٹوں کی بلبلاہٹ، گدھوں کی ڈھینچ، بچوں کا گریہ اور بکریوں کی ممیاہٹ سن رہا ہوں۔

اس نے جواب دیا کہ میں نے سوچا کہ ہر آدمی کے پیچھے اس کے اہل اور مال کو لگا دوں تا کہ وہ ان کی حفاظت کے جذبے سے جنگ کرے۔ درید نے کہا کہ تم تو نرے بھیڑوں کے چرواہے ہو۔ بھلا شکست کھانے والے کو بھی کوئی چیز بھاگنے سے روک سکتی ہے؟ مالک نے اُس کا مشورہ مسترد کر دیا۔ کہا تم بوڑھے ہو، تمھاری عقل بھی سٹھیا چکی ہے۔اللہ کی قسم! یا تو ہوازن میری بات مانیں گے یا میں اس تلوار کی انی پر ٹیک لگا دوں گا اور یہ میری پیٹھ کے آر پار ہو جائے گی، پھر اس نے لات اور عزیٰ کی قسم کھائی اور کہا کہ ہم مسلمانوں سے اتنی شدید لڑائی لڑیں گے کہ

عرب میں اس کی کوئی مثال نہیں ملے گی۔[1]

اللہ کے رسول ﷺ کو ساری خبریں مل رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے بھی تیاری فرمائی۔ 12 ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ کے لیے مکہ سے نکلے۔ فوج کو دس حصوں میں تقسیم فرمایا دس کمانڈر مقرر فرمائے اور وادئ حنین کے ایک جانب خیمہ زن ہوئے۔ مکہ سے روانگی 6 شوال 8 ہجری سینچر کی صبح ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا گورنر مقرر فرمایا۔ دوپہر کے بعد ایک نوجوان نے آپ ﷺ کو دشمن کی تعداد، عورتوں، بچوں اور جانوروں کی آمد کا حال بتایا تو آپ ﷺ نے تبسم آمیز لہجے میں فرمایا: یہ سب کل ان شاء اللہ مسلمانوں کا مال غنیمت بنے گا۔ مسلمانوں کے لشکر میں 2 ہزار کی تعداد میں نو مسلم بھی تھے۔ ان کے دلوں میں ابھی ایمان راسخ نہ ہوا تھا۔ ان میں بعض شوق سے، بعض ایک دوسرے کے کہنے پر اور بعض مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے فوج کے ساتھ چل پڑے تھے۔

شام ہوئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: آج رات کون پہرہ دے گا؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے باری باری اپنے آپ کو پیش کیا۔ ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے آپ کو پیش کیا۔ آپ ﷺ نے موافقت فرمائی۔ عرض کرنے لگے: ایک شرط ہے اور وہ جنت کی بشارت ہے۔ آپ ﷺ نے اس پر رضامندی ظاہر فرما دی۔ اور انھوں نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہرے داری کے فرائض انجام دیے۔

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 4/180، والبدایۃ والنھایۃ: 4/316,317.

ادھر رات آئی تو حضرت انس بن ابی مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے رضا کارانہ طور پر سنتری کے فرائض انجام دیے۔

رات کو صحابہ کرام سو گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے قیام فرمایا۔ فجر طلوع ہوئی۔ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور فجر کی نماز ادا کی۔ ادھر پہرے دار جو رات بھر جاگتے رہے تھے، طلوع فجر کے وقت سو گئے۔ جب آپ ﷺ نے فجر کی جماعت کرائی تو اس دوران مالک اور اس قوم کے لوگوں نے جو تنگ گھاٹیوں اور دروں میں چھپے بیٹھے تھے، نکل کر زوردار حملہ کر دیا۔[1]

[1] البدایۃ والنھایۃ 4/319,318، وتاریخ الإسلام 2/575.

93

اور پھر شکست فتح میں بدل گئی

سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نامی صحابی بیان فرماتے ہیں کہ حنین کے میدان میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر سے نیچے اترے زمین سے ایک مٹھی بھر مٹی اُٹھائی اور اسے دشمنوں کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا: (شَاهَتِ الْوُجُوهُ) ''چہرے بگڑ جائیں۔'' یہ مٹھی بھر مٹی چاروں طرف اس طرح پھیلی کہ دشمن کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ اس سے بھر نہ گئی ہو۔ اور ان کی قوت ٹوٹ گئی۔ چند ساعتیں گزری تھیں کہ دشمن کو شکست فاش ہوگئی۔ ان کے ستر آدمی قتل کر دیے گئے۔ ظہر کی اذان سے پہلے پہلے معرکہ ختم ہوگیا۔ پھر دشمن کا تعاقب اور انھیں زنجیروں میں قید کرنے کا کام شروع ہوا۔ ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اشارہ کر کے فرما رہے تھے تم یہ قیدی پکڑو۔ دوسرے کو اشارہ فرمایا تم بکریاں پکڑو تیسرے کو گائیں اور اونٹ جمع کرنے کا حکم دیا۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قدر

قیدی اور غنائم جمع ہوئے ان کی تعداد کا صحیح علم اللہ ہی کے پاس تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ اب مالک بن عوف کے دستے کی طرف بڑھے اس کی تعداد ایک ہزار تھی۔ وہ شکست کا اعتراف کرتے ہوئے طائف کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ عورتیں بچے مال مویشی اور سامانِ حرب سب کچھ چھوڑ گیا اور طائف کے قلعے میں جا چُھپا۔

صاحب الرحیق المختوم نے مالِ غنیمت کی تفصیل یہ بتائی ہے: قیدی چھ ہزار، اونٹ چوبیس ہزار، بکریاں چالیس ہزار سے زیادہ اور چاندی چار ہزار اوقیہ۔ آپ ﷺ نے یہ مالِ غنیمت جمع کر کے جعرانہ کے مقام پر حضرت مسعود بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں دے دیا۔ قیدیوں میں آپ کی رضاعی بہن شیما بنت حارث سعدیہ بھی تھیں۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو اپنا تعارف کرایا تو آپ نے ایک علامت کے ذریعے انھیں پہچان لیا۔ ان کی بڑی قدر فرمائی۔ عزت افزائی کی اور اپنی چادر بچھا کر انھیں بٹھایا۔ پھر احسان فرماتے ہوئے انھیں ان کی قوم میں واپس بھیج دیا۔[1]

غزوہ حنین میں جہاں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ ثابت قدم رہے وہاں ام سلیم رضی اللہ عنہا نامی معروف صحابیہ بھی ثابت قدم رہیں۔ یہ عظیم المرتبت خاتون خادم رسول اللہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں اور اپنے خاوند کے ساتھ میدان جنگ میں موجود تھیں۔ انھوں نے خنجر تھام رکھا تھا۔ ان کے خاوند ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ یہ ام سلیم خنجر تھامے پھر رہی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ

---

[1] الرحیق المختوم، ص: 552-553.

نے پوچھا: ام سلیم! اس خنجر کا کیا کرو گی؟۔[1] عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ اگر کوئی مشرک میرے قریب آیا تو میں اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔ اللہ کے رسول ﷺ اس خاتون کی جرأت پر مسکرا دیے، ام سلیم پھر بولیں، کہنے لگیں: یہ جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں اور ہماری ہزیمت کا باعث بنے ہیں انھیں تو سزا کے طور پر قتل کر دینا چاہیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ام سلیم (إِنَّ اللّٰهَ قَدْ كَفٰى وَ أَحْسَنَ) ''اللہ نے ہمارا کام بخیروخوبی بنا دیا'' (اس لیے انھیں قتل کرنے سے کیا فائدہ؟)۔[2]

غزوۂ حنین میں آپ کے چچا زاد بھائی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب نے کمال صبر و تحمل اور شجاعت کا مظاہرہ کیا ہر چند کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے۔ مگر انھوں نے اللہ کے رسول کے ساتھ محبت اور وفاداری کا شاندار مظاہرہ کیا۔

انھوں نے آپ ﷺ کے خچر کی لگام تھامی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ لگام تھامنے والا کون ہے؟۔ جواب میں عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ میں ہوں آپ کا چچا زاد بھائی ابوسفیان بن حارث۔ اس سے آپ ﷺ کو بلاشبہ بڑی مسرت اور تقویت پہنچی۔ جنگ کے اختتام پر اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی کافر کو قتل کیا اور اس کا گواہ بھی موجود ہو تو اس کافر کا ساز و سامان اسے ملے گا۔ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک کافر کو قتل کیا تھا۔ وہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میری گواہی کون دے گا؟ ادھر پھر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنا اعلان پھر دہرایا کہ

---

1. الرحیق المختوم، ص: 252.
2. صحیح مسلم، حدیث: 1809.

مقتول کا سامان قاتل کو ملے گا۔ ابو قتادہ پھر کھڑے ہوئے کہ میری گواہی کون دے گا؟ ادھر کوئی شخص گواہی کے لیے کھڑا نہیں ہو رہا تھا۔ تیسری مرتبہ پھر اعلان ہوا ابو قتادہ پھر کھڑے ہوگئے۔ کہا میری گواہی کون دے گا؟ اب اللہ کے رسول نے پوچھا: ابو قتادہ تمھارا کیا قصہ ہے؟۔ عرض کی کہ میں نے فلاں کافر کو قتل کیا ہے۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص کھڑا ہوگیا اور بولا: اللہ کے رسول ﷺ ابو قتادہ نے واقعی اس کافر کو قتل کیا تھا مگر اس مقتول کا سامان میرے پاس ہے: (فَأَرْضِهِ عَنِّي) ''آپ ابو قتادہ کو اس بات پر آمادہ فرمائیں کہ وہ یہ ساز و سامان میرے پاس ہی رہنے دیں۔'' اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: (لَا هَا اللّٰهِ إِذًا، لَا يَعْمِدُ إِلَى أَسَدٍ مِنْ أُسْدِ اللّٰهِ يُقَاتِلُ عَنِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيكَ سَلَبَهُ)

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ابو قتادہ اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے جنگ کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ اس کا حق تمھیں نہیں دیں گے۔'' اللہ کے رسول ﷺ نے بھی ابوبکر صدیق کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔ ارشاد ہوا: ابوبکر کا کہنا درست ہے، تم ساز و سامان ابو قتادہ کے حوالے کر دو۔ ابو قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے وہ ساز و سامان (زرہ، تلوار اور ڈھال وغیرہ) بیچ ڈالا اور اس سے مدینہ کے محلّہ بنو سلمہ میں ایک باغ خریدا۔ اسلام لانے کے بعد یہ پہلا مال تھا جو میرے ہاتھ لگا۔[1]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4322،4321،3142.

94

شجاعتِ رسول کریم ﷺ

غزوۂ حنین کی تفصیل بیان کرتے ہوئے صحابی ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں جب جاگا تو دیکھا کہ مالک بن عوف اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک لشکر جرار تھا جو ہزارہا جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ یہ آناً فاناً میرے پہلو میں پہنچ گیا۔ میں اس حال میں تھا کہ اللہ کے رسول کو آواز دے کر بلوا بھی نہیں سکتا تھا۔ اب مالک نے چلا کر تیر اندازوں کو حکم دیا کہ تیروں کی بوچھاڑ کر دو۔ یہ عرب کے مانے ہوئے تیر انداز تھے۔ پہاڑ کے اوپر تھے۔ ان کو ہدف صاف نظر آتا تھا، چنانچہ وہ مسلمانوں کے اوپر چھا گئے۔ ادھر مسلمان اس اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھے۔ عام لوگوں میں مایوسی پھیل گئی۔ وہ اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کی طرف لپکے اور جس کا جدھر منہ لگا بھاگ کھڑا ہوا۔

ادھر اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کو معرکہ کی طرف واپس بلوایا۔ اس ناگہانی

حملہ میں مسلمانوں کے لشکر کے قدم اکھڑے تو سیرت نگاروں کے مطابق صرف 80 افراد ثابت قدم رہے۔ اور جب دوبارہ زوردار حملہ ہوا تو ان کی تعداد صرف نو یا دس تھی۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہ کا ذکر کیا ہے۔ ان نازک ترین لمحات میں رسول اللہ ﷺ کی بے نظیر شجاعت روز روشن کی طرح سامنے آگئی۔'' یعنی اس قدر ہلاکت بار حملے اور شدید بھگدڑ کے باوجود آپ ﷺ کفار سے مقابلے کے لیے بڑھ رہے تھے اور اپنے خچر کو ایڑ لگا رہے تھے۔...... آپ ﷺ نے خچر کو دشمن کی طرف بڑھایا اور فرمایا: میں ابن العواتِک ہوں۔ آپ ﷺ کی ایک دادی پردادی کا نام عاتکہ تھا۔ آپ ﷺ کا اشارہ اُسی معروف خاتون کی طرف تھا کہ میں ان کا بہادر بیٹا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے میان سے تلوار نکالی اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ

میں نبی ہوں۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں اور میں سردار عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

آپ کے چچا کے بیٹے ابوسفیان بن حارث اور چچا عباس رضی اللہ عنہم نے خچر کی لگام تھام رکھی تھی وہ دونوں اسے روک رہے تھے کہ کہیں آگے نہ بڑھ جائے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آواز اتنی بلند تھی کہ دو پہاڑوں کے درمیان سنی جا سکے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ صحابۂ کرام کو پکاریں کہ اے بیعت رضوان والو۔ اے انصار یا اے مہاجرو۔ اے حدیبیہ والو کدھر ہو؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آواز سنی تو آواز کی طرف پلٹے اور بھاگتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اکٹھے ہو گئے۔

جب سو آدمی جمع ہو گئے تو دشمن کا استقبال کیا۔ بنوخزرج کا نام پکارا گیا بنو حارث بن خزرج کا اسی افراد پر مشتمل گروہ نہایت بہادر دلیر اور جنگجو تھا۔

انھیں پکارا گیا تو آواز سن کر وہ بھی پلٹ آئے...... اللہ کے رسول پکاریں اور جواب نہ ملے۔ یہ کیسے ممکن تھا! انھوں نے میانیں توڑ ڈالیں۔ اور آگے بڑھے اللہ کے رسول بہادروں کے بہادر، شہسواروں کے شہسوار صبح فجر سے دن چڑھے تک دشمن کو روکے کھڑے تھے۔ دامن میں پہاڑ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فریقین میں دھواں دھار جنگ شروع ہو گئی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (الآنَ حَمِيَ الْوَطِيسُ)۔ ''اب جنگ کی بھٹی پوری طرح گرم ہو چکی ہے۔''[1]

اہل علم نے لکھا ہے کہ عربوں میں اللہ کے رسول ﷺ پہلے شخص تھے جنھوں نے جنگی صورت حال کے بیان کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

جنگ حنین میں مشرکین کا جھنڈا بنو ہوازن کے ایک شخص کے پاس تھا، اُسے حضرت علی بن ابی طالب اور ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہم نے جالیا اور مل کر اسے واصل جہنم کر دیا۔ جھنڈا اس کے ہاتھ سے گرا تو مشرکین کی قوت ٹوٹ گئی۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث 1775، وتاریخ الطبری: 182/3، ودلائل النبوۃ للبیھقی: 5/131-133.

95

اس بلند نصیبی کے کیا کہنے

حنین کے میدان میں شکست کھانے کے بعد دشمن کے ایک گروہ نے طائف کا رخ کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ نخلہ کی طرف بھاگے، دوسروں نے اوطاس کی راہ لی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ابو عامر اشعری رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں تعاقب کرنے والوں کی ایک جماعت اوطاس کی طرف روانہ فرمائی۔ وہاں عربوں کے بوڑھے جنگجو کمانڈر دُرید بن صمہ سے مقابلہ ہو گیا۔ درید کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اُسے واصل جہنم کیا گیا۔ اس کے ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ مجاہدین کے اس گروہ میں حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو جُشم کے ایک کافر نے میرے چچا ابو عامر کی طرف تیر پھینکا، جو ان کے گھٹنے میں پیوست ہو گیا۔ وہ ان کی طرف بڑھے پوچھا: چچا جان! یہ تیر آپ کو کس نے مارا ہے؟ انھوں نے حملہ آور کی طرف اشارہ کیا۔ ابوموسی اس کی طرف لپکے۔ جُشمی بھاگ کھڑا ہوا۔ انھوں

نے اس کا پیچھا کیا اور عار دلائی کہ تم میں کچھ دم خم ہے تو مقابلہ کرو۔ تھوڑی دیر بعد دونوں طرف سے تلواریں بلند ہوئیں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے ایسا بھرپور وار کیا کہ اللہ کا دشمن زمین پر گر کر تڑپنے لگا وہ ابو عامر کی طرف پلٹے اور کہا: چچا میں نے آپ کے قاتل کو واصل جہنم کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا: پہلے میرے گھٹنے سے تیر نکالو۔ جب ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے تیر کھینچا تو گھٹنے کا پانی نکل پڑا۔ ابو عامر پر نقاہت چھا گئی۔ ان کا آخری وقت آ چکا تھا۔...... قارئین کرام! اب ذرا اگلے الفاظ غور سے پڑھیے۔ اور سوچیے کہ ایک کھرے مسلمان کی انتہائی تڑپ اور آخری تمنا کیا ہوتی ہے، کہنے لگے: بھتیجے! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا اسلام عرض کرنا اور ان سے میری بخشش کی دعا کے لیے درخواست کرنا، پھر اس دستہ پر ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو کمانڈر مقرر فرمایا تھوڑی دیر بعد آخری ہچکی لی اور شہید ہو گئے۔

دستہ واپس ہوا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ ابو عامر کا قصہ عرض کیا اور ان کی آخری خواہش ظاہر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا، وضو کیا اور دستِ مبارک اُٹھا کر اللہ سے دعا کی: (اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعُبَيْدٍ أَبِي عَامِرٍ) ''اے اللہ !عُبید بن سُلیم ابو عامر کی مغفرت فرما۔'' ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اس قدر بلند کر رکھے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی، پھر عرض کیا: (اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَوْقَ كَثِيرٍ مِنْ خَلْقِكَ مِنَ النَّاسِ) '' اے اللہ! اسے قیامت کے دن اپنی مخلوق میں بہت ساری خلقت پر فوقیت دینا۔'' یہ دُعا سُن کر ابوموسیٰ اشعری کو حضرت ابو عامر کی بلند

نصیبی پر بڑا رشک آیا۔ خود کلامی کرنے لگے: واہ ابو عامر! واہ واہ! کیا خُوب ہے تمھارا مقدر! تمھاری فضیلت کے کیا کہنے!!...... اللہ کے پیارے رسول ﷺ تمھارے لیے اپنے رب کیا کیا مانگ رہے ہیں...... پھر سوچنے لگے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے پروردگار سے راز و نیاز میں مصروف ہیں۔ بحرِ رحمت تموُّج پر ہے۔ کیوں نہ میں بھی فائدہ اُٹھاؤں...... جلدی سے آگے کھسک کر محمد رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوگئے اور بڑی لجاجت سے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! میرے لیے بھی دعا فرما دیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے پیارے ساتھی کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور رب العزت کی بارگاہ میں عرض کیا: (اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِعَبْدِاللّٰہ بْنِ قَیْسٍ ذَنْبَهُ وَأَدْخِلْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مُدْخَلاً کَرِیماً) ''اے اللہ! عبداللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری) کے گناہوں کو معاف فرما اور اسے یوم قیامت اپنی کریمانہ ضیافت سے بہرہ ور فرما۔''[1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4323، وصحیح مسلم، حدیث: 2498

96

تربیت کا ایک اور انداز

ہوازن اور ثقیف کے بہت سے شکست خوردہ افراد حنین سے بھاگ کر اپنے کمانڈر مالک بن عوف کے ساتھ طائف میں قلعہ بند ہو گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک حکمت عملی کے تحت ابھی تک مال غنیمت تقسیم نہیں کیا تھا۔ آپ ﷺ نے پہلے خالد بن ولید کو ایک ہزار مجاہدین کی فوج دے کر طائف روانہ فرمایا، پھر خود تشریف لے گئے۔ دشمن نے سال بھر کا سامان خورد و نوش جمع کر لیا تھا۔ محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا۔ بعض روایات میں دس، بیس، اٹھارہ اور پندرہ دن کا ذکر بھی ہے۔ آپ ﷺ نے اس جنگ میں اُس عہد کی مناسبت سے جدید ترین جنگی اصول اور اسلوب اختیار فرمائے۔ یہیں پہلی مرتبہ منجنیق کا استعمال ہوا۔

قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈالنے کے لیے متعدد گولے پھینکے گئے۔ دبابہ، جسے آج کی اصطلاح میں ٹینک کہا جا سکتا ہے، کا استعمال ہوا۔ دبابہ لکڑی سے بنایا ہوا

چھوٹا سا گھر تھا جس کے اندر گھس کر آگ لگانے کے لیے قلعے کی دیوار تک رسائی ہو جاتی تھی۔ دشمنوں کی تیر اندازی سے بچنے کا یہ مؤثر اور منفرد انداز تھا۔ دشمن کو زیر کرنے کے لیے انگوروں کے باغ کو آگ لگا دی گئی۔ یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ ثقیف نے اللہ اور قرابت کا واسطہ دے کر التجا کی کہ درختوں کا کاٹنا بند کر دیں۔ آپ ﷺ نے اللہ کے واسطے اور قرابت کی خاطر ہاتھ روک لیا۔ دوران محاصرہ اعلان فرمایا کہ جو غلام قلعہ سے اتر کر ہمارے پاس آ جائے اس کو آزادی ہے، چنانچہ 23 آدمی قلعہ سے نکل کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے اور انھیں آزادی مل گئی۔ محاصرے نے طول پکڑا تو ایک حکمت عملی کے تحت اسے ختم کر کے واپس جعرانہ تشریف لائے، طائف سے نکلتے وقت لوگوں نے ثقیف کے لیے بد دعا کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے اس کے بدلے یہ دعا فرمائی: اے اللہ! ثقیف کو ہدایت عطا فرما اور انھیں میرے پاس لے آ۔ ابھی تک مال غنیمت تقسیم نہیں ہوا تھا۔ آپ چند دن مال غنیمت تقسیم کیے بغیر ٹھہرے رہے۔ تاخیر کا مقصد یہ تھا کہ ہوازن والے تائب ہو کر آ جائیں تو جو کچھ کھویا ہے سب لے جائیں۔

حنین کے بعد طائف کے محاصرے کے دوران مالک بن عوف ہوازنی نے اللہ کے رسول ﷺ کو خفیہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر آپ محاصرہ اٹھا دیں تو وہ تائب ہو کر چلا آئے گا۔ اگر ہم شکست قبول کر لیں اور مسلمان ہونے کا اعلان کر دیں تو عرب مدتوں تک ہمیں عار دلاتے رہیں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ نہایت عالی ظرف، دور اندیش، بردبار، بلند حوصلہ اور اعلیٰ اخلاق والے قائد تھے۔ آپ ﷺ

نے محاصرہ اٹھا لیا۔ پھر مالک بن عوف کا انتظار فرماتے رہے مگر اس نے آنے میں تاخیر کر دی۔ اب آپ ﷺ نے مال غنیمت تقسیم کرنا شروع کیا۔ معلم حکمت ﷺ ہر موقع محل پر امت کا تزکیہ اور تربیت فرماتے تھے۔ حکیم بن حزام آئے۔ یہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے۔ انھوں نے حصہ مانگا۔ آپ نے کافی مال دے دیا۔ اب آپ ﷺ نے حکیم کو مال و دولت دنیا کے بارے میں نصیحت فرمائی: سنو! اے حکیم! اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔ اوپر والا ہاتھ وہ ہوتا ہے جو عطا کرتا ہے اور نیچے والا ہاتھ وہ ہوتا ہے جو لیتا ہے۔ قارئین کرام! یہ چند کلماتِ عالیہ کیا تھے؟ بجلی کا کڑکا تھے۔ ان انقلاب آفریں کلمات نے زندگی بھر کے لیے حکیم بن حزام کا مزاج بدل ڈالا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پھر وہ لوگوں کے مال سے ہمیشہ کے لیے مستقل طور پر بے نیاز ہو گئے۔ خلافت صدیقی میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انھیں زکاۃ اور غنیمت کے مال سے حصہ دینا چاہا مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ تربیت محمدی کا ایسا اثر ہوا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انھیں عطیات سے نوازنا چاہا مگر انھوں نے کہا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے جو عہد کر لیا تھا، اُسے ہرگز نہیں توڑوں گا اور ابداً کسی سے کچھ نہیں لوں گا۔[1]

[1] السیرۃ الحلبیۃ: 3/80-84، والرحیق المختوم، ص: 553-555.

97

جود وسخا کے حیران کن مناظر

جنگ حنین کے مال غنیمت میں سے اللہ کے رسول ﷺ نے ابوسفیان بن حرب کو سو اونٹ عطا فرمائے اس نے کہا: میرے بیٹے یزید کو بھی کچھ مرحمت فرمائیے۔ آپ ﷺ نے اسے بھی سو اونٹ دے دیے، اب وہ کہنے لگا کہ میرے بیٹے معاویہ کو بھی کچھ عطا فرمائیے۔ آپ ﷺ نے اُسے بھی سو اونٹ عطا فرما دیے۔ ہر ایک کو چھ، چھ کلو چاندی بھی دی۔ گویا تنہا ابوسفیان کو اس کے بیٹوں سمیت تین سو اونٹ اور اٹھارہ کلو چاندی ملی۔ صفوان بن امیہ کو سو اونٹ ملے، پھر دوبارہ سو، پھر سہ بارہ سو، گویا تین سو اونٹ دیے گئے۔ حارث بن کلدہ کو سو اونٹ عطا ہوئے۔ بنی سلیم کا شاعر عباس بن مرداس آیا اس کو سو کی بجائے پچاس اونٹ ملے تو اس نے قصیدہ پیش کر دیا۔ جس میں بڑے بڑے سرداروں کا ذکر کیا جن کو سو، سو اونٹ عطا کیے گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ اوران کے آباء واجداد عزت و

شرف میں ایک جیسے تھے۔ ان کو مزید پچاس اونٹ مل گئے۔ بعض دیگر سرداروں کو پچاس، پچاس اور بعض کو چالیس چالیس اونٹ ملے۔ حتیٰ کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ محمد ﷺ اس طرح بے دریغ خرچ کرتے ہیں کہ انھیں فقر کا اندیشہ ہی نہیں ہوتا۔ (مؤلفة القلوب) کو دینے کے بعد حضرت زید بن ثابت کو مال غنیمت کی تقسیم کا حساب لگانے پر مامور کیا گیا۔ ہر مجاہد کے حصے میں چار چار اونٹ اور چالیس چالیس بکریاں آئیں۔ شہسواروں میں سے ہر ایک کو بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں ملیں۔

عصر کی نماز ادا فرمائی تو مالک بن عوف نصری اپنے ہمراہیوں کے ساتھ آ پہنچا۔ یہ کل تک اپنی فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ شاعر تھا، خطیب تھا اور اپنے قبیلہ ہوازن کا سردار تھا۔ مگر آج اللہ کے رسول کے سامنے عاجزی سے کھڑا ہوا تھا۔ کہنے لگا: یا رسول اللہ: (أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ) اور پھر کچھ اشعار پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ جو دے دی گئی۔ ان اشعار میں اللہ کے رسول کی مدح اور تعریف تھی۔ آپ نے ان اشعار کو استحسان کی نگاہ سے دیکھا۔ اور فرمایا: (مَاذَا تُرِيدُ يَا مَالِكُ؟) ''مالک کیا چاہتے ہو؟'' اس نے کہا کہ میں اپنے قیدی، لونڈیاں بچے اور مال و دولت (جو چھوڑ کر بھاگا تھا) لینا چاہتا ہوں۔

ارشاد ہوا: دونوں میں سے ایک چیز اختیار کر لو: مال و دولت یا عورتیں اور بچے۔ اس نے کہا: عزت و ناموس کے مقابلے میں کوئی چیز افضل نہیں۔ صحابہ کو حکم دیا کہ ان کی عورتیں اور بچے واپس کر دو۔ بعض بدو سرداروں نے انکار کیا۔

آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا جس میں عفو و درگزر کا ذکر تھا پھر فرمایا کہ میں اپنا اور بنی عبدالمطلب کا حصہ واپس کرتا ہوں۔ دوسرے لوگوں نے بھی یکے بعد دیگرے عورتیں اور بچے واپس کر دیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے سارے قیدیوں کو ایک ایک قبطی چادر عطا فرما کر واپس بھیج دیا۔

پھر آپ نے جعرانہ ہی سے عمرہ کا احرام باندھا اور عمرہ ادا کیا۔ عتّاب بن اسید کو مکہ کا والی مقرر فرمایا۔ 24 ذی القعدہ 8 ہجری کو مدینہ منورہ واپسی ہوئی۔ [1]

[1] الرحیق المختوم، ص: 555-558 ، وملخص من السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 4/141-146 ، وتاریخ اسلام: 2/602-609.

انہوں نے اتنا دیا کہ لینے والا شرما گیا!!

غزوہ حنین میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی۔ اس موقع پر جو مال غنیمت ہاتھ لگا اس کی تفصیل یہ ہے:

قیدی 600، اونٹ 24000، بکریاں 40000 سے زیادہ، چاندی چار ہزار اوقیہ، یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم مالیت کی۔ یہ مال غنیمت جعرانہ کے مقام پر حضرت مسعود بن عمرو غفاری کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اور جب تک رسول اللہ ﷺ غزوہ طائف سے فارغ نہ ہو گئے، اسے تقسیم نہ فرمایا۔

ایک دن صفوان بن امیہ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تھا۔ ایک وادی سے گزر ہوا جو اونٹوں اور بکریوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے چرواہے بھی ساتھ تھے۔ صفوان نے یہ منظر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابو وہب! کیا یہ مال تمھیں بھلا معلوم ہو رہا ہے؟ وہ بولا: جی ہاں۔

ارشاد ہوا: اس وادی میں جو کچھ ہے سب تمھارا ہوا۔ صفوان کا ذہن صاف ہو گیا۔ اندھیرا چھٹ گیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا: محمد ﷺ کتنے عالی ظرف، کس درجہ کریم، کس قدر سخی اور کیسے حوصلہ مند انسان ہیں، اور ایک میں ہوں کہ میں نے ان سے کتنی زیادتیاں کیں۔ کیسے کیسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا لیکن میرے جرائم اور سفاکیوں کے برعکس ان کا کرم، ان کی بخشش اور ان کی عطا کتنی بے پایاں ہے؟!!۔ ایسی فیاضی، دریا دلی اور سیر چشمی یقیناً کسی نبی ہی کی ہو سکتی ہے۔ کوئی اور شخص تو اس قدر عطا کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اسلام اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت ان کے دل میں راسخ ہو گئی۔ فوراً کلمہ شہادت پڑھا اور صحابیت کے شرف سے مشرف ہو گئے[1] رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ عَنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ أَجْمَعِينَ۔

[1] المغازي للواقدي، ص: 629.

99

اور طائف نورِ توحید سے جگمگا اُٹھا

غزوہ حنین کی فتح کے بعد طائف کے علاقے میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ مگر بنو ثقیف بدستور کفر اور ضد پر قائم تھے۔ ان کا ایک بڑا سردار عروہ بن مسعود ثقفی مدینہ منورہ آیا۔ اسلام قبول کیا اور واپس طائف چل دیا۔ نیا نیا اسلام قبول کیا تھا، ایمان کی تازگی سے سرشاری بھی عجب چیز ہے انھوں نے قوم کے کفر کے باوجود ڈٹ کر کلمہ توحید بلند کیا۔ اپنے گھر کی گمٹی پر کھڑے ہو گئے، بلند آواز سے اذان دی۔ ساتھ ہی چاروں طرف سے تیر برسنا شروع ہو گئے۔ تیروں کی بوچھاڑ کے باوجود اذان دیتے رہے۔ بالآخر جاں بحق ہو گئے۔[1]

اب آگے چلیے۔ طائف کا سب سے متکبر اور بد دماغ سردار عبدیا لیل جس نے ایک دن اللہ کے رسول کو بے حد ستایا اور آزردہ کیا تھا اپنے ساتھیوں کے

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 4/192,191، وتاریخ اسلام: 2/669,668.

ساتھ مدینہ کی جانب روانہ ہوا۔ شہر سے باہر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا پہرہ تھا۔ ان دونوں کا جد امجد ایک تھا۔ محبت اور پیار تو اپنوں میں ہوتا ہی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب عقیدے میں بھی یک رنگی پیدا ہونے لگے۔ مغیرہ نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آداب گفتگو بتائے۔ ان کا خیمہ مسجد نبوی میں نصب کرایا۔ تاکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب سے دیکھ سکیں اور آپ کے اخلاق کا مطالعہ کریں۔ اس وفد میں چھ افراد شامل تھے۔ سب سے کم عمر عثمان بن ابو العاص ثقفی تھے۔ یہ لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے جاتے رہے۔ بالآخر ایک دن عبدیا لیل اور اللہ کے رسول کے درمیان براہ راست مکالمہ ہوا۔ عرض کیا: آپ ہمارے ساتھ تحریری معاہدہ کرلیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شرط اسلام ہے ورنہ نہیں۔ عبدیا لیل مسلمان ہونے کے لیے ہی آیا تھا۔ اللہ کے رسول نے ایک مدت پہلے طائف سے نکلتے وقت جو دعا فرمائی تھی اس کی قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس کا بڑا سردار اپنے ساتھیوں سمیت مسلمان ہوگیا۔ اس نے اب کچھ شرائط اور مطالبات پیش کیے۔ زنا کی اجازت چاہی۔ فرمایا: اسلام میں اس کی نہایت سختی سے ممانعت ہے۔ اس کی اجازت نہیں مل سکتی۔ سودی کاروبار کی اجازت طلب کی گئی۔ ارشاد ہوا کہ سود قطعاً حرام ہے، پھر سورۂ بقرہ کی آیت: 278 کی تلاوت فرمائی۔ ''مسلمانو! اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ سے ڈر جاؤ اور تمہارا جو سود لوگوں کے ذمے باقی ہے، اُسے چھوڑ کر اصل رقم پر اکتفا کرلو۔'' شراب پینے کی فقط اس قدر رعایت طلب کی کہ یہ گندا مشروب گاہے بگاہے دوا

کے طور پر استعمال کر لیں۔ یہ مطالبہ بھی مسترد کر دیا گیا۔ اب اس نے کہا: نماز کی چھوٹ تو دے دیجیے۔ ارشاد ہوا: جس دین میں اللہ کی عبادت نہ ہو، وہ بھلائی اور خیر سے خالی ہوگا۔

اہل طائف کا سب سے بڑا بت ''لات'' تھا۔ اس کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ اس کی سلامتی کے لیے تین سال کی مہلت مانگی گئی۔ آپ ﷺ نے انکار فرمایا، پھر دو سال، پھر ایک ماہ تک کی اجازت چاہی مگر تمام درخواستیں مسترد ہوئیں۔ اور واضح کر دیا گیا کہ اللہ کے احکامات اور نصوص شریعت پر ہرگز کوئی سمجھوتہ یا سودے بازی نہیں ہو سکتی۔ وفد نے تنہائی میں مشورہ کیا، پھر اللہ کے رسول ﷺ کی تمام شرائط تسلیم کر لیں۔ آخر میں عبد یالیل نے عرض کی: لات کو ڈھانے کا انتظام اللہ کے رسول ﷺ خود کریں۔ آپ ﷺ نے یہ شرط منظور کر لی۔ نوشتہ لکھ دیا۔ عثمان بن ابی العاص ثقفی کو ان کا امیر مقرر فرمایا کہ وہ اسلام سیکھنے میں پیش پیش تھے۔ قرآن پڑھتے تھے اور اللہ کے رسول سے دین کی باتیں دریافت کرتے رہتے تھے۔

عبد یالیل اور ان کے رفقاء کو خطرہ تھا کہ جس طرح عروہ بن مسعود کو ان کی قوم نے قتل کیا ہے، کہیں ان کے ساتھ بھی ان کی برادری وہی سلوک نہ کرے۔ انھوں نے واپسی پر اہلِ طائف سے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا، پھر نہایت حکمت و دانش سے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ پہلے تو ان پر نخوت جاہلیہ غالب آئی۔ مگر بالآخر سب نے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ اور خالد بن ولید کی سرکردگی میں چند صحابہ کو ''لات'' کی مسماری کے لیے روانہ کیا گیا۔ انھوں نے گرز مار مار کر لات کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اس کی بنیادیں کھود کر اسے زمین کے برابر کر دیا۔ یوں طائف کے علاقے میں چند ہی روز میں دیکھتے ہی دیکھتے توحید کے زمزمے گونج اُٹھے اور اس سرزمین سے قیامت تک کے لیے کفر و شرک کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

[1] ملخص از البدایۃ والنھایۃ: 5/31-36، وتاریخ الإسلام: 2/668-672، وتاریخ الطبري: 3/194,195.

قیصر روم کی گواہی

صلح حدیبیہ 6 ہجری میں ہوئی۔ فریقین کے درمیان دس سال ایک دوسرے سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا، لہٰذا پورے جزیرۂ عرب میں امن و امان قائم ہو گیا۔ قافلے بلا روک ٹوک ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگے۔ امن کے اس دور سے ابنائے اسلام نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اسلام کی دعوت کو اس عہد امن وسلامتی میں خوب پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس عرصہ میں بادشاہوں اور امراء کے نام خطوط لکھے۔ اور اپنے بہترین سفارت کاروں کے ذریعے یہ خطوط شاہانِ وقت کو پہنچائے۔ روم کی بادشاہت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت (Super power) تھی۔ اسے حال ہی میں ایرانیوں پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ ایک خط روم کے بادشاہ ہرقل کے نام جس کا لقب قیصر تھا، دحیہ بن خلیفہ کلبی کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔ ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو

کلب سے تھا۔ یہ بے حد خوبصورت تھے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کئی بار ان کی شکل میں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس تشریف لائے۔ان دنوں ہرقل حمص سے ایلیاء (بیت المقدس) آیا ہوا تھا۔ یہاں اس کی آمد کا سبب کیا تھا؟ یہ جاننے کے بعد ہم آگے بڑھیں گے۔

روم اور ایران کے درمیان جنگ ہوتی رہتی تھی۔ یہی دونوں اس زمانے کی بڑی طاقتیں تھیں۔ایک دوسرے کے علاقوں کو فتح کرنا اور وہاں کے لوگوں کو محکوم بنانا بڑی عام اور معمولی سی بات تھی۔قیصر روم ہرقل کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ وہ یونانی النسل تھا۔ رومیوں کی بادشاہت کا مرکز روم (اٹلی) تھا۔ یہ رومی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ رومیوں نے شام کے علاقوں پر بہت مدت پہلے 64 قبل مسیح سے قبضہ کر رکھا تھا اور ان علاقوں پر ان کی حکومت تواتر سے چلی آرہی تھی۔ رومی بھی بت پرست تھے۔لیکن بعد میں قسطنطین نامی شخص سے متأثر ہو کر عیسائی ہو گئے۔ رومی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی ایک کا مذہب آرتھوڈکس تھا۔جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا اور دوسرا حصہ مغربی جانب تھا جس کا دارالحکومت روم تھا اور ان کا مذہب کیتھولک تھا۔

ایران کی قیادت میں تکبر،فخر اور غرور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ان کے ہاں شدید اختلافات تھے۔اندر ہی اندر بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔انھی دنوں ان دونوں بڑی طاقتوں میں جنگ ہوئی جس میں رومیوں کو فتح ہوئی،ایرانی فوجوں کی پے در پے شکست کے بعد ایرانی بادشاہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے

قتل کر دیا اور خود اقتدار پر قابض ہو گیا۔ خسرو وہی بد بخت تھا جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے نامۂ مبارک بھیجا تو اس نے اسے چاک کر دیا۔ اور نہایت متکبرانہ انداز میں بولا میری رعایا میں سے ایک حقیر غلام اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو جب اس واقعے کی خبر ہوئی تو ارشاد فرمایا: میرا خط چاک کر کے اس نے اپنی بادشاہت کو پارہ پارہ کر لیا ہے، چنانچہ وہی ہوا جو آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

اہل فارس نے رومیوں سے ان کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کی شرط پر صلح کر لی۔ اور وہ صلیب بھی واپس کر دی جس کے بارے میں نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی تھی، چنانچہ اس فتح و نصرت پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے قیصر روم حمص سے ایلیا (بیت المقدس) گیا ہوا تھا۔ قیصر روم ہرقل کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بازنطینی رومی سلطنت میں 610ء سے لے کر 641ء تک برسر اقتدار رہا۔ 611ء میں ایران سے جنگ چھڑی تو ایرانیوں نے شام، فلسطین، ایشیائے کوچک کے بڑے علاقے اور مصر پر قبضہ کر لیا۔ 614ء میں بیت المقدس کو بری طرح تباہ کیا اور عیسائیوں کی صلیب مقدس اٹھا کر مدائن لے آئے۔ سورۂ روم کے آغاز میں فرمایا گیا کہ رومی نزدیک کی زمین (فلسطین) میں مغلوب ہو گئے۔ اور وہ چند ہی سال میں غالب آ جائیں گے۔ اور پھر قرآن کریم کی پیش گوئی 622ء میں اس وقت پوری ہو گئی جب ایرانیوں کی شکستوں کا دور شروع ہوا۔ 624ء میں رومیوں کو شام میں فتح حاصل ہوئی۔ عین اسی وقت

مسلمان مدینہ منورہ میں غزوۂ بدر کی کامیابی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ پھر 628-629ء میں رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کو خط لکھا۔ عرصۂ امن کے دوران اہل مکہ نے ابوسفیان کو مجبور کیا کہ وہ ایک بڑا تجارتی قافلہ لے کر شام جائیں۔ اہل مکہ کے تجارتی قافلے اکثر شام جاتے تھے۔ مگر ہجرت اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد یہ کاروبار تقریباً ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

چنانچہ ابوسفیان کی سربراہی میں بڑا تجارتی قافلہ ترتیب دیا گیا جس میں مکہ کے تقریباً ہر مرد اور عورت کا کچھ نہ کچھ تجارتی مال شامل تھا۔ جب اللہ کے رسول کا نامہ مبارک دحیہ کلبی کے ہاتھوں قیصر کو ملا، یہ قافلہ انھی دنوں فلسطین کے شہر غزہ میں مقیم تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جو نامہ مبارک لکھا گیا تھا اس کی عبارت صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد (ﷺ) کی جانب سے ہرقل عظیم روم کی طرف۔

اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے۔ تم اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے۔ اسلام لاؤ، اللہ تمھیں تمھارا اجر دوبارہ دے گا۔ اور اگر تم نے روگردانی کی تو تم پر اریسیوں (رعایا) کا (بھی) گناہ ہوگا۔ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے...... اور وہ یہ...... کہ ہم اللہ

کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور اللہ کے بجائے ہمارا بعض بعض کو رب نہ بنائے۔ پس اگر لوگ رخ پھیریں تو کہہ دو کہ تم لوگ گواہ رہو، ہم مسلمان ہیں۔

ہرقل نے اس نامۂ مبارک کی بڑی قدر کی۔ اسے چوما، آنکھوں سے لگایا، خوشبو میں بسایا اور ایک چمڑے میں محفوظ کر لیا۔ اس وقت بھی استنبول کے عجائب گھر میں جو نامۂ مبارک محفوظ ہے۔ وہ غالباً یہی مکتوب گرامی ہے۔ بہر حال کتابوں میں اس نامۂ مبارک کی جو تصاویر ہیں وہ ہرقل کو لکھے گئے نامۂ مبارک ہی کی ہیں۔ ہرقل نے دحیہ کلبی کی بھی بڑی عزت کی۔ انھیں مال اور پارچہ جات سے نوازا۔ اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ جب تک یہ ہماری حدود میں ہیں اس وقت تک ان کی مکمل حفاظت کی جائے۔

اب ہرقل نے اپنے خاص آدمیوں کو بلوایا اور کہا کہ جاؤ کسی ایسے عربی اور قریشی کو تلاش کرو جو ان دنوں اس علاقے میں آیا ہوا ہو تا کہ میں اس سے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں، چنانچہ انھیں غزہ میں ابوسفیان اور ان کے قافلے کے دیگر افراد مل گئے۔ انھیں فوراً ایلیاء (بیت المقدس) میں ہرقل کے شاہی محل میں پیش کیا گیا۔ ہرقل نے دربار سجایا ہوا تھا اس وقت اس کے ارد گرد روم کے بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جو عربی زبان سے واقف تھے۔ بہرحال ترجمان کی وساطت سے گفتگو کا آغاز ہوا۔ ہرقل تخت شاہی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر تاج چمک رہا تھا۔ اس نے وفد کو بلایا اور

پوچھا کہ تم میں اس شخص کا جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے، سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ان لوگوں میں سوائے ابوسفیان کے بنو عبد مناف میں سے کوئی نہیں تھا، اس لیے ابوسفیان نے کہا کہ میں اس کا سب سے زیادہ قریب النسب ہوں۔ ہرقل نے پوچھا: تمھارا اس سے کیا رشتہ ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ وہ میرے چچا کا بیٹا ہے۔

ہرقل نے کہا کہ ابوسفیان کو میرے قریب لاؤ اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے کھڑا کر دو۔ اب اس نے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان کے پیچھے جو لوگ کھڑے ہیں ان سے کہو کہ میں ابوسفیان سے اس نبی کے بارے میں سوالات کروں گا۔ اگر ابوسفیان جھوٹ بولے تو تم اُسے ٹوک دینا اور کہہ دینا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ لوگ میرے اوپر جھوٹ بولنے کا الزام لگائیں گے تو میں یقیناً اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیتا۔ یہاں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ ہر زمانے میں معززین اور شرفاء کے نزدیک جھوٹ بولنا نہایت مکروہ بات رہی ہے اور اس گھناؤنی عادت کو ہر دور میں نفرت اور مذمت کے قابل سمجھا گیا ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں مجھے یقین تھا کہ اگر میں غلط بیانی بھی کروں تو یہ لوگ میری تردید نہیں کریں گے۔ لیکن میں سردار تھا۔ میں اپنے آپ کو اس بات سے بالا سمجھتا تھا کہ جھوٹ بولوں۔ یہ میرے لیے شرم کی بات تھی۔ میں جانتا تھا کہ کم از کم وہ واپس مکہ جا کر لوگوں سے میرا جھوٹ ضرور بیان کریں گے، اس لیے میں نے کوئی

جھوٹ نہیں بولا۔ اب ابوسفیان ہرقل کے سامنے تھے۔ ان کے قافلے والے ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ ترجمان کی وساطت سے ہرقل نے سوال کیا: اس نبی کا حسب نسب کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ اونچے نسب والا ہے۔

ہرقل نے پوچھا: کیا یہ نبوت والی بات اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے کہی تھی؟ میں نے کہا: نہیں۔

ہرقل نے پوچھا: کیا اس کے باپ دادا میں سے کبھی کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ ہرقل نے کہا: کیا بڑے بڑے لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے یا کمزور لوگوں نے؟ میں نے جواب دیا: بلکہ کمزور لوگوں نے۔

ہرقل نے دریافت کیا: یہ لوگ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ میں نے اعتراف کیا کہ یہ لوگ بڑھ رہے ہیں۔

ہرقل نے پوچھا: کیا اس دین میں داخل ہونے کی بعد کوئی شخص اس دین سے منحرف ہو کر مرتد بھی ہوا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔

ہرقل نے کہا: اس نے جو بات کہی ہے کیا اس کے اظہار و اعلان سے پہلے اس پر کبھی جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگا؟ میں نے کہا: بالکل نہیں۔

ہرقل نے کہا: کیا وہ بدعہدی بھی کرتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، البتہ ہم لوگ آج کل اس کے ساتھ صلح کی ایک مدت گزار رہے ہیں۔ معلوم نہیں اس بارے میں وہ آئندہ کیا کرے گا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ اس فقرے کے سوا مجھے اور کہیں اپنی کوئی بات گھسیڑنے کی گنجائش ہی نظر نہیں آئی۔

ہرقل نے پوچھا: کیا تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی ہے؟: میں نے کہا: جی ہاں۔ ہرقل نے کہا: تو تمھاری اور اس کی جنگ کیسی رہی؟ میں نے کہا: جنگ ہم دونوں کے درمیان برابر سرابر کی چوٹ ہے۔ کبھی وہ ہمیں زک پہنچا دیتا ہے اور کبھی ہم اسے زک پہنچا دیتے ہیں۔

ہرقل نے کہا: وہ تمھیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا: وہ کہتا ہے: صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ تمھارے باپ دادا جو کچھ کہتے تھے اسے چھوڑ دو۔ اور وہ ہمیں نماز، سچائی، پرہیزگاری، پاک دامنی اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے۔

اس گفتگو کے بعد ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا: ''تم اس شخص (ابوسفیان) پر واضح کر دو کہ میں نے تم سے اس نبی (ﷺ) کا نسب پوچھا تو تم نے بتایا کہ وہ اونچے نسب کا ہے...... تو دستور یہی ہے کہ پیغمبر اپنی قوم کے اونچے نسب میں بھیجے جاتے ہیں۔

پھر میں نے دریافت کیا کہ کیا یہ بات اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے کہی تھی؟ تم نے کہا: نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات اس سے پہلے کسی اور نے کہی ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ یہ شخص ایک ایسی بات کی نقالی کر رہا ہے جو اس سے پہلے کہی جا چکی ہے۔

پھر میں نے دریافت کیا کہ کیا اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ تم نے بتلایا کہ نہیں۔ اگر اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ

شخص اپنے آباؤ اجداد کی بادشاہت کا طلبگار ہے۔

پھر میں نے یہ پوچھا گیا کہ کیا جو بات اس نے کہی ہے اس کے اعلان سے پہلے تم لوگوں نے کبھی اس پر جھوٹ کا الزام عائد کیا؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں...... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں پر تو جھوٹ نہ بولے مگر اللہ پر جھوٹ بولے۔

میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ بڑے لوگ اس کی پیروی کررہے ہیں یا کمزور لوگ؟ تو تم نے بتایا کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے...... اور حقیقت یہی ہے کہ اکثر کمزور لوگ ہی پیغمبروں کے پیروکار ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ کیا اس دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص منحرف ہو کر مرتد بھی ہوتا ہے تو تم نے بتلایا کہ نہیں...... اور حقیقت یہی ہے کہ ایمان کی بشاشت جب دلوں میں پیوست جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

اور میں نے دریافت کیا کہ کیا وہ بدعہدی بھی کرتا ہے؟ تو تم نے بتایا کہ نہیں...... یقیناً پیغمبر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بدعہدی نہیں کرتے۔

میں نے یہ بھی پوچھا کہ وہ کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ تو تم نے بتایا کہ وہ تمھیں اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیتا ہے، بت پرستی سے منع کرتا ہے اور نماز، سچائی اور پرہیز گاری و پاکدامنی کا حکم دیتا ہے۔

تو جو کچھ تم نے بتلایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ شخص بہت جلد میرے ان دونوں قدموں کی جگہ کا مالک ہو جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نبی آنے والا ہے لیکن مجھے

یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم لوگوں میں سے ہو گا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں اس کے پاس پہنچ سکوں گا تو میں اس سے ملاقات کا شرف ضرور حاصل کرتا۔ اور اگر اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔''

اس کے بعد ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کا خط منگوا کر پڑھا۔ جب خط پڑھ کر فارغ ہوا تو وہاں کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور پھر شور مچنے لگا۔ ہرقل نے ہمارے بارے میں حکم دیا کہ ان لوگوں کو دربار سے باہر بھیج دیا جائے۔ جب ہم لوگ باہر لائے گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ابو کبشہ کے بیٹے کا معاملہ بڑا زور پکڑ گیا۔ اس سے تو بنو اصفر کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔ اس کے بعد مجھے برابر یقین رہا کہ رسول اللہ (ﷺ) کا دین غالب آ کر رہے گا یہاں تک کہ اللہ نے میرے سینے میں اسلام کو جاگزیں کر دیا۔[1]

یہ قیصر پر نبی ﷺ کے نامۂ مبارک کا وہ اثر تھا جو اس نے قبول کیا اور جس کا مشاہدہ ابو سفیان نے کیا۔ اس نامۂ مبارک کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ قیصر نے رسول اللہ ﷺ کے اس نامۂ مبارک کو پہنچانے والے، یعنی دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو مال اور پارچہ جات سے نوازا۔ لیکن جب حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ یہ تحائف لے کر واپس ہوئے تو حسمی نامی مقام پر قبیلہ جذام کے کچھ لوگوں نے ان پر ڈاکہ ڈال کر سب کچھ لوٹ لیا۔ حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو اپنے گھر کے بجائے سیدھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ تفصیل سن

---

1. صحیح البخاري، حدیث: 7، وفتح الباري: 1/31-44.

کر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کی سرکردگی میں پانچ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت روانہ فرمائی۔ جہاں تیزی سے پہنچ کر انھوں نے دشمن کا قلع قمع کر دیا۔[1]

[1] الرحیق المختوم، ص: 475.

101

عربوں کے ایک مشہور بت کا نام لات تھا۔ طائف کا سب سے بڑا قبیلہ ثقیف اس کا متولی تھا۔ طائف کے علاقے میں لات نے کفر و شرک کی ظلمتیں پھیلا رکھی تھیں۔ یہ مربع شکل کی چٹان تھی۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ لات دیوی مرنے کے بعد اس چٹان میں داخل ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس چٹان پر ایک مکان بنا دیا گیا۔ لوگ دور دور سے خیر و برکت کے حصول کے لیے یہاں آتے تھے۔ اپنی اولاد کے نام بھی اس بت کے نام پر رکھتے تھے۔ یہ بت طائف شہر کے وسط میں نصب تھا۔ 9 ہجری میں ثقیف کا وفد مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے لیے مسجد کے ایک گوشے میں خیمہ لگوا دیا جائے تا کہ یہ قرآن سنیں اور صحابۂ کرام کو نماز پڑھتے دیکھ سکیں۔ یہ لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آتے جاتے رہے۔ اور آپ ﷺ انھیں اسلام لانے کی دعوت دیتے رہے۔ وفد کے

سردار نے زنا کاری، سودخوری اور شراب نوشی کی اجازت طلب کی اور یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان کے معبود ''لات'' کو نہ توڑا جائے اور انہیں نماز سے معاف رکھا جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان میں سے کوئی بھی بات منظور نہیں کی۔ آخر انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے کرتے ہوئے اسلام قبول کرلیا، البتہ یہ شرط لگائی کہ لات کو ڈھانے کا انتظام اللہ کے رسول ﷺ خود کریں گے۔ ثقیف اسے اپنے ہاتھوں ہرگز نہ ڈھائیں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی یہ شرط قبول فرمالی اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں چند صحابہ کو طائف بھجوایا کہ وہ لات کے بت کو پاش پاش کردیں۔ ان میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ خود ان کا تعلق بھی بنوثقیف ہی سے تھا۔ اسلام لانے سے پہلے یہ خود بہت بڑے سردار تھے۔ لات کو ڈھانے کے لیے انھوں نے کدال اٹھالی اور اپنے ساتھیوں سے چپکے سے کہنے لگے کہ میں ذرا ایک جھوٹ موٹ کردار ادا کروں گا اور آپ لوگوں کو ثقیف کی خفیف حرکت سے ہنساؤں گا۔

انھوں نے کدال کی ضرب لگائی، پھر خود ہی گر کر اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ طائف کے باشندے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے زوردار نعرہ مارا۔ خوش ہوکر کہنے لگے: اللہ مغیرہ کو ہلاک کرے۔ دیکھو، دیکھو، ذرا اس کا حشر دیکھو۔ اسے دیوی نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ پھر وہ مغیرہ کے رفقاء سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: کوئی اس کے قریب آکر ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ اتنے میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ یک دم اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا: اللہ تمھارا برا کرے یہ کمینی

بدذات دیوی محض پتھر اور مٹی کا ڈھیر ہے۔ اللہ عزوجل سے عافیت طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو، پھر اس کے دروازے پر ضرب لگائی۔ اس کو ریزہ ریزہ کرنے کے بعد اس کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے دوسرے ساتھی بھی شامل ہو گئے اور اس دیوی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہاں تک کہ اس کو پیوند خاک کر دیا۔ اس بُت کا مجاور کہنے لگا اگر آپ لوگ اس کی بنیاد کھودیں گے تو وہ غضبناک ہو کر آپ کو زمین میں دھنسا دے گا۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: مجھے اجازت دیں، میں اس کی بنیاد بھی کھود ڈالوں گا۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی بنیاد کھود کر مٹی باہر نکال دی۔ اس کا گارا بنا دیا۔ اس کا زیور اور لباس نکال لیا۔ ثقیف کے لوگ یہ منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ زیور اور لباس لے کر اپنی ٹیم کے ساتھ مدینہ طیبہ واپس آئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ اسی دن تقسیم فرما دیا۔ اور اللہ کی طرف سے اپنے نبی کی نصرت اور دین کے اعزاز پر اس خالق و مالک کی حمد و ثنا کی۔[1]

[1] زاد المعاد: 450,449/3، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 4/184-186، والرحیق المختوم، ص: 590,589.

اسلامی تاریخ کے سنہرے واقعات پر مشتمل مؤلف کی دیگر کتب

سنہرے اوراق
سنہری کرنیں
سنہرے فیصلے
سنہرے حروف
سنہرے نقوش

سنہرے اوراق

''سنہرے اوراق'' اس کتاب میں روشن ماضی کے زندہ اور چمکتے دمکتے واقعات پر مشتمل ہماری سنہری تاریخ کے گمشدہ اوراق ہیں جو ہر چھوٹے بڑے کے لیے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ذہن کو جلا دینے والے اور سوچنے سمجھنے پر مجبور کرنے والے یہ حیران کن مشاہدات اور سبق آموز قصے ہماری کردار سازی اور شخصیت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

سنہری کرنیں

''سنہری کرنیں'' عورت کی شخصیت کے ایسے تمام پہلو جن میں اس کی ذہانت، شجاعت، تقویٰ، پرہیزگاری اور بہادری ظاہر ہوتی ہو، اس کتاب کی زینت ہیں، جن کے مطالعے سے نہ صرف تمام خواتین اور بچیوں میں بہتری کا ایک نیا ولولہ اور جذبہ پیدا ہوگا بلکہ مطالعہ کرنے والے مردوں کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ شجاعت، ذہانت اور صبر وتحمل کی صفات کس طرح بھرپور انداز میں عورتوں میں بھی موجود رہتی ہیں۔

سنہرے فیصلے

''سنہرے فیصلے'' اس کتاب میں نبی ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، نامور مسلم حکمرانوں اور قاضیان کرام کے وہ فیصلے شامل کیے گئے ہیں جن سے دنیا میں عدل وانصاف کی سنہری روایات قائم ہوئی ہیں اور آنے والے حکمرانوں، قاضیوں اور ججوں کو ان سے گرانقدر رہنمائی ملتی ہے۔ ان تابندہ روایات اور واقعات کو اس لیے بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے میں صالح اقدار پھر سے فروغ پائیں اور عوام اسلام کے انفرادی واجتماعی عدل کی برکتوں سے مستفید ہونے لگیں۔

سنہرے حروف

''سنہرے حروف'' اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین، ائمہ عظام، فقہائے کرام، سلف صالحین، نیک طینت خلفاء وسلاطین، صلحائے امت، سپہ سالاران اسلام اور مجاہدین صف شکن کی سیرت اور کردار جو مسلمانان عالم کیلیے مشعل راہ ہیں کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات دلکش پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔

سنہرے نقوش

''سنہرے نقوش'' درحقیقت ایک پکچر گیلری ہے۔ اس میں اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگوں کی زندگی کے سچے واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے جس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ نیکی کا لازمی نتیجہ کامیابی اور فتح مندی ہے جب کہ گناہ چاہے کتنا ہی چھپ کر کیا جائے وہ ہمارا پیچھا کرتا ہے، اپنا تاوان لیتا ہے اور ندامت کے ساتھ سچی توبہ نہ کی جائے تو ہمیشہ خون کے آنسو رلاتا ہے۔

الأنوار من سيرة سيد الأبرار

(باللغة الأردية)

سیرت کی کتب کو عام کرنا اور اسے ہر گھر تک پہنچانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اگر اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت احسن پیرائے میں اسلام دشمنوں تک انہی کی زبان میں پہنچادی جائے تو پھر اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ان کے نظریات وخیالات یقینی طور پر تبدیل ہو جائیں گے۔

اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کی کتابوں کو سونے کے پانی سے شائع کرواتا اور انہیں عام کرتا۔ میری خواہش ہوگی کہ اہل ثروت اس اہم کام میں اپنا کردار ادا کریں۔

اس کتاب کے کوئی کاپی رائٹ نہیں ہیں۔ دنیا کے ہر شخص کو اسے شائع کرنے ،فوٹو کاپی کرنے اور کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

کم از کم مجھے سیرت پاک کے مطالعہ سے جو فوائد حاصل ہوئے ان میں ایک یہ ہے کہ الحمد للہ، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ فِدَاهُ أَبِي وأُمِّي ونَفْسِي وكُلُّ شَيْءٍ عِنْدِي ۔ بلاشک وشبہ وہ رب کائنات کے بعد سب سے اعلیٰ اور ارفع ہستی ہیں۔ ہم ان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ مگر یہ ادنی سی کاوش شاید لکھنے والے اور پڑھنے والوں کی مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔ اسی امید اور تمنا کے ساتھ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ (مؤلف)

ISBN: 978-9960-500-28-7